مشرف عالم ذوقی
نیلام گھر

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

نیلام گھر

(ناول)

مصنف:
مشرف عالم ذوقی

انتساب

امّی مرحومہ

اور

ابا حضور

جناب **مشکور عالم بصیری**

کے نام

——مشرف عالم ذوقی

باب اوّل

کریم بیگ

(۱)

دھوپ کی شعائیں کمرے میں داخل ہوئیں تو کریم بیگ کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے — ٹیبل پر چائے کی پیالی رکھی تھی ۔اس وقت تک وہ بھلی خوبی جاگ چکے تھے، جب رضیہ چائے لےکر کمرے میں داخل ہوئی اور ٹیبل پر رکھ کر ایک نگاہ ڈالتی ہوئی رخصت ہوگئی...... کریم بیگ نے ٹھنڈے ہاتھوں سے چائے کی پیالی تھامی اور غٹ غٹ کر کے پی گئے ۔اور دن ہوتا تو وہ رضیہ سے گھنٹوں اِدھر اُدھر کی گفتگو لے کر بیٹھ جاتے مگر کبھی کبھی ادھر اُدھر کی فکر حاوی ہوجاتی ہے ۔اور دل بھاری بھاری ہوجاتا ہے ۔کام سے توجہ ہٹ جاتی ہے...... کچھ یہی حال اس وقت کریم بیگ کا تھا۔چپ چاپ اٹھے ۔ گھڑی دیکھی اور سنگھار میز کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے ۔آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔سفید ہوتے ہوئے بالوں پر نظر ڈالی ۔ بوڑھے ہوتے ہوئے نقوش کا جائزہ لیا۔مگر آج کچھ بھی دل نہ چاہا۔یہ بھی نہ ہوا کہ آگے بڑھ کر خضاب کی شیشی ہی اٹھا لیتے ۔اور پھر سے اوجھل ہوتی جوانی کو واپس بلا لیتے ۔

خاموشی سے باہر آئے ۔ برآمدے میں انجم ٹیبل پر دونوں پاؤں رکھے اخبار پڑھنے میں مشغول تھا——— آہٹ ملتے ہی اس نے سر اٹھایا پھر جھکا لیا۔کچن میں کام کرتی ہوئی رضیہ نے بھی نگاہیں اٹھا کر انجم کی طرف دیکھا اور پھر سے اپنے کام میں مشغول ہوگئی ۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے باتھ روم میں آئے ۔ منہ دھویا اور دوبارہ کمرے میں واپس آگئے ۔ زندگی شاید تبدیلی چاہتی ہے ۔ ورنہ اپنے آپ سے گھبراہٹ کی یہ بات تو پہلے کبھی نہ تھی ۔ وہ ہمیشہ سج دھج کر آفس پہنچتے اور قہقہوں کے نیم عریاں اور کبھی کبھی عریاں سیلاب میں گم ہو جاتے ۔اب زندگی تھک چکی ہے......

دماغ پر وحشت سوار ہے......شب و روز کی مشغولیات میں بھی بکھراؤ آنے لگا ہے۔ زندگی تبدیلی چاہتی ہے۔ کمرے میں لوٹے تو وہی ویرانہ پن ہمیشہ کی طرح موجود تھا۔ کارنس سے جھولتی ہوئی تسبیحوں پر گرد پڑ چکی تھی۔ طاق پر رکھا ہوا قرآن شریف دھول سے اٹا ہوا تھا۔ خاموشی گھر کا حصہ بن چکی تھی......زمانے کی ہتھیلیوں پر کتنے ہی گلاب کھلے اور مرجھا گئے......وقت گزرتا رہا— قرآن شریف کو پڑھنے کا وقت نہیں تھا...... تسبیحوں پر گرد جمی رہی......

نئی نسل کا انجم ترقی کے پنکھ پر سوار، نئے زمانے کے ساتھ ساتھ اُڑا جا رہا تھا ......اور یہ قصور انجم کا نہیں تھا......نئے ماحول میں وہ انجم کی تربیت کرنا بھول گئے تھے۔

قصور بوڑھی تجربہ کار آنکھوں کا تھا جو گیلی ہو گئیں......کہ آہ! کچھ بھی نہ دے سکے انجم کو۔ نہ باپ کا پیار۔ نہ مذہب کی تعلیم اور وہ خود کتنے مذہبی رہے۔ یہ احساس بھی دل کے زخم تازہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ آزادی کے بعد سے لے کر اب تک گزرے ہوئے شب و روز کے ایک ایک لمحے بچھو کی طرح ڈس رہے تھے۔

آج پھر آفس میں تقریب ہے— شاندار تقریب— صاحب نے وقت سے پہلے ہی سب کو بلایا ہے۔ پورے اسٹاف کی دعوت ہے۔ اور دعوت میں کیا کیا ہوتا ہے۔ وہ بھی اس سے بخوبی واقف ہیں......کل تک وہ خوشی خوشی اور گرم جوشی کے ساتھ تقریبات کے جام آگے بڑھ کر اُٹھا لیا کرتے تھے— مگر جانے کیوں آج آفس میں ہونے والی تقریب کے نام پر دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا......شاید جسم تھک چکا ہے......وہی پرانا کھیل کھیلتے ہوئے، وہی بے ہنگم قہقہوں کی فضا میں جیتے ہوئے......اور اب......تبدیلی چاہئے—ان کے دماغ کا پرندہ اونچی لمبی پرواز کے بعد اب تھک چکا ہے— اور آرام چاہتا ہے۔ دماغ کی نسیں جھنجھنائیں تو کریم بیگ جیسے تاریکی میں اترتے چلے گئے۔ گہری سانسیں لیں۔ خود کو دوبارہ بحال کرنے کی

کوشش کی۔ ہونٹوں کو گول کر کے سیٹی بجانی چاہی مگر ہونٹ پھس بول کر رہ گئے۔ تھکے قدموں سے وہ پھر سنگھار میز کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ سوٹ تبدیل کیا۔ نکٹائی درست کی اور پھر آئینے میں اپنی شناخت کی......سفید بالوں کا مسئلہ سامنے تھا— فیشن کے سارے سامان میز پر کھلے ہوئے تھے۔ مگر جانے کیوں ہاتھ کانپ گئے۔ خضاب کی شیشی نگاہوں میں چبھنے لگی۔ آگے بڑھ کر کنگھی اٹھائی اور بال سنوارنے میں لگ گئے۔ گھڑی دیکھی تو وقت ہو چلا تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتے تھے۔ تقریب کے نام پر پھر وہی بے ہنگم رقص آفس کے لان میں شروع ہو جائے گا......رقص و سرور کی محفل جمے گی۔ قہقہوں کے بے ہنگم شور گونجیں گے—

مگر— کیا اب وہ ایسا کر سکیں گے۔؟

کریم بیگ مختلف موڑ والی شاہراہ پر آکر اچانک ٹھٹھک گئے۔ زندگی تبدیلی چاہتی ہے۔ اور اُنہیں لگا— ایک آوارہ پرندہ لمبی اونچی اڑان کے بعد اب پوری طرح تھک چکا ہے......

وہ کمرے سے باہر آئے تو انجم تب تک اخبار پڑھ چکا تھا۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ حیرانی سے ان کی جانب دیکھا......پھر اخبار بڑھاتے ہوئے بڑبڑایا......

ابا......جہان پور میں پھر ہندو مسلم فساد ہو گیا۔

اُس کا انداز ایسا تھا کہ کریم بیگ نے محسوس کیا۔ جیسے انجم طنزیہ نظروں سے کہہ رہا ہو......ابا لیجئے ملک کا ایک اور تحفہ......ابا......ایک اور نئے فساد کے بارے میں پڑھئے......ابا کیا ان احمقوں کو مذہب کے نام پر فسادات سے روکنے والا کوئی نہیں ہے ......ابا......کیا دنیا میں ایک اور صرف ایک مذہب کا قیام ممکن نہیں ہے، جس کو متفقہ طور پر سب لوگ تسلیم کر لیں—

ابا......

کریم بیگ کے جسم میں لرزہ طاری ہوا— آگے بڑھ کر اخبار اٹھایا......
سرسری نظر اخبار پر ڈالی — چیل، کوؤں اور گدھوں جیسی خبروں سے دل دہل گیا— ذہن بھاری بھاری ہو گیا......آزادی کے بعد ملک میں اگر واقعی کسی چیز نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے......تو وہ ہے فساد......لڑائی جھگڑا......دنگے......قتل......

اخبار پڑھنے میں طبیعت نہیں لگی تو اسے ٹیبل پر ڈال دیا۔ تب تک رضیہ کچن سے نکل کر برآمدے میں آ چکی تھی......وہ بھی اُسے دیکھ کر کچھ کم حیرت میں نہ تھی۔

اُس نے آہستہ سے پوچھا......''آج آفس میں تقریب ہے نا......''

''ہاں'' اُنہوں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''پھر — بال بھی ٹھیک طرح سے نہیں سنوارے......خضاب کی شیشی تو موجود تھی نا......'' رضیہ کی آنکھوں میں بے چینی تھی—

''اب بوڑھا ہو گیا ہوں......اب بہت بوڑھا محسوس کرتا ہوں خود کو......''

رضیہ چونک کر عجیب نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ جیسے اس جواب کی توقع نہ ہو......کہ اچانک آج......اتنے برسوں کے بعد آج یہ بوڑھا ہونے کا احساس تمہیں کیسے ہوا......؟ یہ تھکن تمہارے جیسے آدمی پر کیسے غالب آ گئی......؟

مگر وہ کچھ بھی نہ پوچھ سکی......ٹھیک اُسی طرح جس طرح وہ اُس کے سوال کا اچھی طرح جواب نہ دے سکا......بس خاموشی سے چند کبوتر اُڑائے اور افسردہ قدموں سے باہر آ کر آٹو رکشہ پر بیٹھ گئے......

''چلو پرنس لین۔''

اُس نے تھکی آواز میں کہا......آٹو تیزی کے ساتھ شاہراہوں سے گزرنے لگا۔ شہر میں کتنی رونق ہے......لوگ کس تیزی سے بھاگ رہے ہیں۔ بھاگتے ہوئے لوگوں کے ہمراہ تو وہ بھی چلا تھا مگر آہ......کتنا پیچھے چھوٹ گیا— جہاں ابی حضور چھوڑ

گئے تھے۔ بس وہیں کا وہیں۔

آگے ٹریفک جام تھا......آٹو والے نے تیزی سے بریک لگایا......پھر رکشے والے کی آنکھیں اُس کی آنکھوں میں اُترتی چلی گئیں۔

''صاحب......صاحب ایک بات کہوں،......مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے''

''ہاں یہ بھی ترقی کی ایک مثال ہے۔'' وہ آہستہ سے بولا......

''ایک بات کہوں صاحب؟'' آٹو والا پھر روانی سے بولا۔ یہ جو منسٹر لوگ آئے دن شہر میں آتے رہتے ہیں......وہ کس لئے آتے ہیں صاحب؟ ہم کو تو سمجھ میں نہیں آتا......کوئی بات پلے نہیں پڑتی......اور صاحب ان کے آگے پیچھے اتنی ساری گاڑیاں کیوں دوڑتی پھرتی ہیں......اور یہ لاکھوں روپے کے اسٹیج کس لئے بنائے جاتے ہیں صاحب......

کتنے ہی سوال آٹو والے کے لب پر آ کر تھم گئے تھے۔

''یہ سب اُن کے تحفظ کے لئے کیا جاتا ہے'' وہ سوالوں کے سیلاب سے گھبرا کر بولے۔

''نہیں صاحب!'' آٹو والے نے اپنی بھنویں سکوڑیں...... مجھے تو ایسا لگتا ہے صاحب— جیسے یہ سب اپنی غریبی پر پردہ ڈالنے کے لئے ہو رہا ہو......

اس نے عجیب نظروں سے آٹو والے کی جانب دیکھا...... جواب بھی اپنے اندر کے تجسس کے پرندے کو آواز دے کر پوچھ رہا تھا: صاحب یہ ایشیاڈ میں کتنا روپیہ خرچ ہوا ہوگا......

اس ناوابستہ تحریک سے ہمیں کیا ملا صاحب......

صاحب......صاحب......

کریم بیگ کے سامنے جیسے اندھیرا پھیلتا چلا گیا......لفظ گونگے ہوتے چلے

گئے ......آوازوں نے جب چہار جانب سے ان کے دماغ پر شب خون مارا تو اچانک
جیسے خوف کے زہریلے سانپ نے اُنہیں نگل لیا......بس اتنا ہی کہہ سکے......میرے
دوست! میرے عزیز......سوالوں کے ان کوڑھ سے پرے ہو جاؤ۔

میرے بھائی......ہم سب ایک ہی آٹو میں سوار ہیں......جس طرح بہت سی
باتیں تم نہیں جانتے ہو ویسے ہی میں نہیں جانتا ہوں ......اور جو باتیں تم جانتے ہو وہ
میں جانتا ہوں ......ایسی باتیں بس اپنے سمجھنے کے لئے ہوتی ہیں ......جن کے حل
تلاش کرنے یا کسی سے پوچھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہمیں صرف یہ دیکھتے رہنا ہے
کہ ملک کتنی ترقی کر رہا ہے......ملک میں کیا کیا ہو رہا ہے۔

''ہاں صاحب......آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

آٹو والا اچانک بالکل کاٹھ ہو گیا......اُس کی نظریں باہر کی جانب رینگ
رہی تھیں— ٹریفک پولیس راستے کے صاف ہونے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اُس نے آٹو
کی چال میں تیزی لائی اور کریم بیگ کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کا گلہ رندھ آیا ہو......اور
ابی حضور کے وقت کا وہ فرمانبردار نا سمجھ کریم بیگ ایک بار پھر سے زندہ ہو گیا ہو......اور
پھر وہی نئی سوچ گرد کی طرح ان کے احساس پر جمتی چلی گئی......شاید زندگی ایک تبدیلی
چاہتی ہے......بڑی عجیب وغریب تبدیلی۔

آفس کے قریب رکشہ رُکا تو آٹو والے کو پیسہ تھمانے کے بعد وہ رکشہ سے اُتر
پڑے۔ آفس میں لوگوں کی چہل پہل شروع ہو گئی تھی— رنگ برنگے جھالروں
بیلونوں اور قمقموں سے آفس کو دلہن بنایا گیا تھا......اور دن ہوتا تو اُس کی نگاہیں خیرہ ہو گئی
ہوتیں......اور وہ تیز قدموں سے اپنے لوگوں میں شامل ہو کر بے ہنگم قہقہوں اور نقرئی
ٹھٹھول کے طوفان میں کھو گئے ہوتے ......مگر شاید نہیں ......تبدیلی کا وہی احساس اُن
کے رگ وپے میں داخل ہو کر اس ہنگامے کی دنیا سے انہیں بہت دور لے گیا تھا......

وہ دھیمے قدموں سے آگے بڑھے—لوگوں کے جھنڈ قدم قدم پر شور کرتے
ہوئے نظر آ رہے تھے......وہ سب سے بخوبی واقف ہیں......سب اپنے یار ہیں......
نئے مزاج کے ان شہریوں کو وہ بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔

یہ ''رتھ'' ہے......ان کا ہم خیال......رتھ بھی باغی ہے......وہ دنیاوی رشتوں
کو فضول سمجھتا ہے...... جب بھی موقع ملتا ہے اُسے اتنا ضرور سمجھاتا ہے...... کہ—
لبادے کے خول سے آزاد ہونے کے بعد ہی ہم ایک نئی دنیا کا تصور کر سکیں گے......
جانے کیسی نئی اور انوکھی دنیا کی بات کرتا ہے......وہ اس تصور کو کبھی نہ سمجھ سکا—

یہ مائیکل ہے سیدھا سادا آدمی۔ مگر مذہب نہیں مانتا—ہاں اتنا ضرور ہے
کہ کرسمس کے روز بڑی زوردار پارٹی دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ دن عیش کا ہے۔ بس
عیش کرو......

یہ سموئل ہے......اُس کا روم پارٹنر......اور رتھ کا ہم خیال......جس کے ساتھ
قہقہوں اور ہنگاموں میں وہ بھی برابر کا شریک رہا ہے۔ سموئل رشتہ نہیں مانتا۔ اسی لئے
وہ مذہب کو بھی بے بنیاد کہتا ہے۔ وہ بھی بس عیش کرو' کے نعرے ساری دنیا میں پھیلا
دینا چاہتا ہے۔

یہ رگھوبیر ہے۔ تھوڑا جھینپو ضرور ہے۔ مگر عورتوں کے معاملے میں بڑا تیز ہے۔

یہ مسز بھٹناگر ہیں......کبھی یہ صاحب کی منظور نظر تھیں مگر اب ان کی جگہ مس
نیلی نے لے لی ہے۔ جب سے شوہر کا انتقال ہوا ہے تب سے دھرم کرم سے اعتقاد
اُٹھ گیا ہے۔ سیدھی سادی عورت ہیں۔

یہ ورما ہے......تیز طرار...... یاروں کا یار...... جماتا زیادہ ہے......کرتا کم
ہے۔ یہ بھی اپنے دوستوں کا ہی ہم خیال ہے۔

اور یہ مس نیلی......

کریم بیگ باری باری سب کو دیکھتے ہیں۔مگر جانے کیوں آج سب کے بدن سے لپٹے ہوئے سانپ اُسے دکھائی دے رہے ہیں۔سب قہقہے پر قہقہے لگا رہے ہیں......آج پہلی بار یہ سب اچھا نہیں لگ رہا ہے۔کریم بیگ کی طبیعت میں ایک بھونچال سا آ گیا ہے۔مگر وہ کیا کر سکتے ہیں..رضیہ اور انجم کی پرواہ نہ ہوتی تو وہ یہ سب چھوڑ چھاڑ کر تنہائی کے شہر میں گم ہو گئے ہوتے......مگر اس کے باوجود وہ آفس کے قانون سے اچھی طرح واقف ہیں۔ذہن پر کیسا بھی بوجھ ہو......اس بوجھ کو پرے ڈال کر انھیں بھی قہقہہ لگانا ہے......ہنسی ٹھٹھول میں شامل ہونا ہے۔

کیونکہ صاحب سب کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں......

اُس نے اپنے قدم تیز کئے ...... رگھو بیر نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا......اور اُس کے ہونٹوں سے تقریباً نشے کی حالت میں چیختی ہوئی آواز نکلی......

''ارے کریم......تم!''

سموئل نے پلٹ کر دیکھا......اور بھونچکا رہ گیا......نہیں......نہیں یہ اپنا کریم نہیں ہو سکتا......یقین نہیں آتا کہ یہ اپنا کریم ہے...... یہ سفید بالوں والا اپنا کریم نہیں ہو سکتا......

''ہاں میں ہی ہوں دوست! میں ہی ہوں......''

وہ زبردستی مسکرایا......اور ایک پھس پھسا قہقہہ اُن کی نذر کرتا ہوا بولا......

یارو! بوڑھے ہونے کا احساس جاگا تو ایسا لگا جیسے سب فضول ہے...... یہ خضاب...... یہ تیل وغیرہ اصلیت کو نہیں چھپا سکتے''

''مگر پھر بھی یار''———رتھ بولا......تو تو بالکل ہی بوڑھا نظر آنے لگا ہے۔مسز بھٹناگر اور مس نیلی تو تجھے پہچان ہی نہیں پائیں گی۔''

وہ پھر ہنسا......''مگر اب میں تو خود کو پہچاننے لگا ہوں......''

یہ کہہ کر وہ دوبارہ وہی زبردستی والا قہقہہ مار کر ہنسا......مگر اس بار سب اچانک خاموش ہو گئے۔اور بڑی عجیب نظروں سے اسے گھورنے لگے۔پھر سب ایک ساتھ بولے۔

''نہیں......نہیں تو اب کریم نہیں رہا......تو کوئی فلاسفر ہو گیا ہے۔''

اور پھر سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے...... نشے کی حالت میں ایک نے کریم بیگ کا گریباں پکڑ لیا۔اور رونی صورت بنا کر بولا......

بول کیوں ہو گیا ایسا......اتنا بوڑھا کیوں ہو گیا۔لگتا ہے تو بھٹک رہا ہے۔مگر ہم تجھے بھٹکنے نہیں دیں گے......

سب کی آنکھیں نشہ آلود ہو رہی تھیں......کریم بیگ کی عجیب حالت تھی۔وہ کیا کہتا......کہ ہٹو ہٹو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو...... یہ اعضا اب تھک چکے ہیں...... ان بے ہنگم قہقہوں سے بور ہو چکے ہیں......اپنے ہاتھ ہٹا لو...... پھر سے مجھے اُس دلدل میں مت دھکیلو— کراہیت کا احساس ہو رہا ہے مجھے — تم سب سے گھن آ رہی ہے۔

مگر وہ کچھ نہ بول سکا۔صرف چپ رہا......

دوستوں کی نشہ بھری آنکھیں اب تک اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں......

''بول کیوں ہو گیا تو ایسا......؟''

نہیں یار......میں تو وہی کریم بیگ ہوں......وہی پرانا کریم بیگ...... ہر آدمی بوڑھا ہوتا ہے......ویسے ہی میں بھی بوڑھا ہو گیا۔'

سب ہنس پڑے......قہقہے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر گئے ......

ذرا ٹھہر کر ورما بولا'' آؤ اندر چلیں...... پارٹی بس شروع ہوا چاہتی ہے۔

باس انتظار کر رہے ہوں گے۔‘‘

ہنگامے، ٹھٹھول کرتے ہوئے لوگوں کے ساتھ وہ بے دلی سے صاحب کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ بڑے بڑے بینر پر آفس کی تقریب اور جشن کے عنوانات جگمگا رہے تھے—— خوبصورت قالینیں بچھی تھیں...... باس آگے والی کرسی پر مس نیلی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مس نیلی کا ہوش رُبا لباس دوستوں کی نگاہوں میں دھنک کی طرح چمک رہا تھا۔

کریم بیگ ہر لمحہ گہری اندھیری کھائی میں اُترتا چلا جا رہا تھا۔ تم بے حیائی کے مینارے پر چڑھ گئے ہو کریم بیگ...... کیا اُتر سکو گے......؟

کریم بیگ کا پور پور لرز گیا...... ہاں میں بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ کہتے ہیں جب کسی قوم کا اخلاق کمزور پڑ جائے تو اُس قوم کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ میں ایک ہلکی سی مدافعت بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سچ ہے کہ اب یہ سب مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مگر میں بہت کمزور ہو گیا ہوں......اور میں اپنی کمزوری کے خلاف ایک آواز بلند نہیں کر سکتا۔

ان کا گلہ بھر آیا کہ وہ بے حد مجبور تھے......

شاید ہمیشہ سے مجبور رہے تھے۔

پھر قہقہوں میں چیئرز کی ترنگ گونجی...... کریم بیگ لڑکھڑا گئے اور جیسے اونچے مینارے سے لڑکھڑا کر آن کی آن میں زمین پر گر گئے ......آنکھیں لہو کا گھونٹ پی کر رہ گئیں......احساس مردہ چھپکلی کی طرح بے جان ہو کر دیوار کے جھول میں قید ہو گیا......اور اندر رہ رہ کر بس یہی سوال گونج رہا تھا۔

’وہ کب احتجاج کرنے کے قابل ہوں گے؟‘

(۲)

کریم بیگ لڑکھڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوئے۔ سر پھٹا جا رہا تھا۔ سوچ کے آوارہ طیور نے دل و دماغ پر بسیرا کر لیا تھا۔ دماغ کی نسیں بری طرح سے جھنجھنا رہی تھیں۔ اور یہ ساری باتیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ جس تبدیلی کے خواہاں ہیں اُس راستے میں اُن کی اپنی کمزوریوں کا آہنی پل کھڑا ہے......

کچن سے رضیہ کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ کریم بیگ نے قدموں میں تیزی لائی۔ دھڑ دھڑاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ لائٹ آن کی اور دروازہ بند کر لیا۔ پھر تھکے ہارے بستر پر گر گئے۔ آنکھیں اب تک نشے کی حالت میں جل رہی تھیں۔ کمرہ سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ دیوار پر مذہبی کلینڈر آویزاں تھے جس پر کئی سال پیچھے کی تاریخ قہقہہ لگا رہی تھی۔ ان ٹنگے ہوئے مذہبی کلینڈروں نے جیسے ان کے ارد گرد اپنا کساؤ تنگ کر لیا تھا۔ ایک چھوٹا سا معصوم بچہ قرآن شریف کی تلاوت کر رہا تھا۔ رحل کھلا تھا اور قرآن شریف پر اُس کی معصوم نظریں جھکی ہوئی تھیں...... ریک پر رشتے داروں کے یہاں سے آئے ہوئے عید کارڈ سجے تھے......

وہ ایک ختم ہوتی ہوئی تہذیب کے گواہ تھے۔ اور اس سے بھی زیادہ بھیانک بات یہ تھی کہ وہ بھی آج سے پہلے اس تہذیب کا ایک حصہ تھے۔

پھر یوں ہوا کہ کمرہ پشچاتاپ کے آنسوؤں سے بھر گیا۔ تکیے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر منہ ڈھک لیا اور زار و قطار رونے لگے۔ آزادی کے بعد یہ کیسا سکون پایا ہے...... میں نے ...... کہ اپنی کمزوریوں کا غلام بن گیا۔ اور بدمست لوگوں کے قافلے میں شامل ہو گیا ...... کہ وہ تسبیحیں جو ابا حضور اور دادا حضور کے ہاتھوں میں اتنی بھلی

لگتیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں عقیدت کے جگنو سا جایا کرتے، وہ تسبیحیں
اچانک اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئیں...... اور پھر بد قسمتی کا دور آیا...... بدمست
ابابیلوں نے آسمان کو ڈھک لیا۔ اور جو پایا تو خواب خواب منظر تھے۔ مصنوعیت کی
حسین جنت نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ پھر تسبیحیں میلی ہوتی چلی گئیں۔ قرآن شریف
طاق پر رکھ دیئے گئے۔ باقی بچے کلینڈر جو دیواروں پر اب بھی آویزاں تھے۔ بس یہی
کچھ تھا۔ جو چیخ چیخ کر اُن کا رشتہ مذہب سے جوڑ رہا تھا......

کریم بیگ اچانک جیسے کسی ڈراؤنے خواب سے جاگے۔ جانے کہاں سے
ظفر بیگ ان کے سامنے آ کر کھڑے ہوگئے۔ بستر مرگ پر آخری سانسیں لیتے
ہوئے۔ آنکھیں آنسوؤں سے تر اور کمرے میں دہشت کا گونگا پرندہ منحوسیت بھری
آواز میں روئے جا رہا تھا—۱۹۴۸ء کی وہ شب آشوب......

دروازے بند تھے۔ کھڑکیوں پر پردے گرے تھے......امی حضور کی آنکھیں
رہ رہ کر مچل جاتیں۔

اس وقت ان کی عمر صرف چودہ سال کی تھی— شہر میں فساد پھوٹ پڑا۔ یہ
خبر ایک آگ تھی۔ ایک ایسا زہر جس کے دوبارہ چکھنے کے احساس سے کوئی بھی واقف
نہ تھا...... بدمعاش سارے شہر میں آگ لگائے پھر رہے تھے۔ ہنستے کھیلتے لوگ موت
کی نیند سلائے جا رہے تھے......مکانات شعلے اُگل رہے تھے اور بلوائیوں کے بے ہنگم
قہقہے گونج رہے تھے...... آزادی سے قبل جن آنکھوں نے خوف کا لفظ نہیں جانا وہ
آنکھیں سہمی جا رہی تھیں کہ اب تو جان کا ڈر اپنے بھائیوں سے بھی پیدا ہو گیا ہے......
اب کہیں خیر نہیں۔

اور ابی حضور بیگ نے ایک ڈوبتی سانس لی۔

''بیٹا! کاش میں مرگیا ہوتا۔ کیا یہی دن دیکھنا تھا مجھے......یہی کچھ سننے کے

لئے اُس نے یہ زندگی دی تھی...... یہ آزادی اکیلے نہیں ملی......سب کا خون شامل ہے
اس میں......اور کیا کیا ارمان پلے تھے دل میں کہ آزادی سارے فرق پاٹ دے گی
......کوئی فساد نہیں ہوگا۔ دنگے نہیں ہوں گے۔ خون کی ہولیاں اب نہیں کھیلی جائیں
گی۔ یہ سارا قصور تو فرنگیوں کا ہے— جس نے زبان پر بھی قفل لگا دیے ہیں— سی
ڈالے گئے ہیں ہونٹ......رنگوں کے فرق کا بے بنیاد مسئلہ سامنے لا کھڑا کیا گیا ہے
...... یہ سب قصور تو ان فرنگیوں کا تھا۔ اور جب ایسا سوچا تو مذہب کی دیو قامت
دیواریں ہم نے اُسی دن ڈھا دیں۔ اور یہ تہیہ کیا تھا...... دو بھائی مل کر ایک گھر میں
رہیں گے......ایک دوسرے کے گھر آیا جایا کریں گے......محبت اور دوستی کے ماحول
میں ایک ساتھ سانس لیں گے۔ مگر آزادی کو ابھی ایک سال بھی پورے نہیں گزرے
کہ یہ کیا سننے میں آ رہا ہے......کہ دو بھائی لڑ گئے...... یہ سننے سے تو موت بہتر ہے۔

ابی حضور ظفر بیگ بولے چلے جا رہے تھے۔ امی حضور بار بار آنکھیں مل
رہی تھیں۔ کبھی آنسوؤں کو پوچھتیں، کبھی دلاسے دیتیں کہ نوج! آزادی نے ایک سال
بھی سکون کی سانس لینے نہ دیا۔ پھر آنکھیں ملتی ہوئی اُس کے حواس باختہ چہرے کو
دیکھتی ہوئی بولیں......

''بیٹا۔ کریم! سب دروازے دیکھ لئے نا......ٹھیک سے بند ہیں نا......؟

ہاں امی۔

وہ فرمانبردار بیٹے کی طرح سر جھکا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

ابی حضور کی کانپتی آواز پھر سے دیواروں کو لرزہ کر گئی......کیوں بند کرواتی ہو
دروازہ...... کریم...... یہ سارے دروازے کھول دو میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایک
بھائی دوسرے بھائی کا گلہ کیسے گھونٹتا ہے......

پھر ابی حضور کی حالت ابتر ہوتی چلی گئی......اور وہ دیر تک عالم نزع میں

بڑبڑاتے رہے......

''کانتا پرساد......سن رہے ہو......کانتا پرساد اچھا ہوا تم قبل از وقت چلے گئے۔آزادی کے بعد کا یہ زہریلا دھواں دیکھنے کے واسطے زندہ نہ رہے۔ہم نے جو دیواریں مل کر ڈھائی تھیں— آج کچھ ناسمجھوں نے وہاں ایک نئی دیو قامت دیوار پھر سے کھڑی کر دی ہے— اب تم ہی بتاؤ کانتا پرساد! اس نئی مضبوط دیوار کو ڈھانے کے لئے پھر کون سی آزادی کو آوازیں دینی پڑیں گی۔

ابی حضور کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی......

کریم کے دل کے پھپھولے جیسے پھوٹ گئے......کبھی مٹھیاں بھینچتیں، کبھی چہرے پر جوش آتا......کبھی اپنی بیچارگی پر ترس آتا......اس ماحول میں دل نہ لگا تو ٹہلتا ہوا کھڑکی کے پاس آ گیا......سامنے ایک گز کے فاصلے پر رما کانت جی کی کھڑکی کھلی تھی اور پنڈت رما کانت کی مرجھائی آنکھیں ایک ٹک خلاء میں گھور رہی تھیں......

جب دونوں کی نظریں ملیں تو پنڈت جی کی آنکھیں بھر آئیں۔آنسوؤں کی ایک موٹی لکیر رخسار پر پھیلتی چلی گئی۔

''بیٹا! تمہارے ابا کیسے ہیں''

پنڈت جی کی ٹھہری ہوئی آواز اس کے سینے میں اُترتی چلی گئی۔اُس کا جی چاہا کہ کہے۔اب آگ تو لگ ہی چکی ہے۔اب اس آگ پر نمک چھڑکنے سے کیا حاصل......مگر پھر خیال آیا۔تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بجتی— جس خوف سے ابی حضور بستر مرگ پر لیٹے لیٹے اپنی موت کو آواز دے رہے ہیں......وہی خوف پنڈت رما کانت کی آنکھوں میں بھی چھپا ہوگا— آزادی کے بعد کی یہ سرخ دھوپ ان کی آنکھوں میں بھی اتر آئی ہوگی......

رما کانت کے لہجے کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے اس کا کلیجہ دُکھ گیا......

بس آہستہ سے بولا۔

''ابی کی طبیعت بہت خراب ہے......وہ موت کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔''

''ظفر کچھ غلط نہیں مانگ رہا ہے''

پنڈت چچا کی آنکھیں بھر آئیں......جس نے آزادی سے قبل کا وہ مثالی ملاپ دیکھا ہو۔وہ بھائی بھائی کے جھگڑے کیسے قبول کر سکتا ہے......زمانہ بہت خراب آ گیا ہے......''

پنڈت جی خود کو روک نہیں پا رہے تھے۔آنکھیں گیلی تھیں......اپنی آواز کی تاب نہیں لا سکے۔آنسوؤں میں بہہ کر بس اتنا کہہ سکے۔

''ظفر سے کہنا۔میرے حق میں بھی وہی دعائیں مانگے جو اپنے لئے مانگ رہا ہے......''

اور اتنا کہہ کر جیسے اندر دبا آتش فشاں ایک دم سے پھوٹ گیا......آواز کی تاب نہ لا سکے، آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ چلی۔اپنی جگہ سے پیچھے مڑے اور کھڑکی بند کر لی۔

وہ حواس باختہ ساکت نظروں سے بہت دیر تک بند کھڑکی کو گھورتا رہ گیا۔

کریم بیگ کے اندر ایک آندھی اُٹھ رہی تھی۔اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

چند لمحوں تک افسردہ نظروں سے بند کھڑکی کو گھورتا رہا۔

پھر ایسا لگا جیسے پنڈت جی اپنی ساری محبت آنکھوں میں سمیٹے اس سے کہہ رہے ہوں...... بیٹا! ظفر سے کہنا میرے لئے وہی دعائیں مانگے جو اپنے لئے مانگ رہا ہے۔

اُس کے قدم بھاری ہو گئے۔اس جگہ ایک پل ٹھہرنا محال ہو گیا۔دل میں یہ

خیال آیا...... جیسے یہ کھڑکی بند نہیں ہوئی ہو بلکہ رما کانت اُس کی نسل کے لوگوں سے ایک چیلنج کر رہے ہوں ۔ ایک وعدہ لینا چاہ رہے ہوں ۔ ہم اور ظفر تمہارے ماں باپ جیسے بزرگ تو اب ہمیشہ کے لئے تم سے دور بہت دور چلے جائیں گے...... اب یہ کام تمہارا ہے ۔ تم جیسے نوجوانوں کا...... یہ کھڑکی ہمیشہ کے لئے بند رہنے دو...... یا ہمیشہ کے لئے کھول دو...... کبھی نہ بند ہونے کے لئے......

وہ تھکا ہارا جس وقت ابی حضور کے کمرے میں لوٹا...... اُس وقت رحیمو چا کے ہاتھ دُعا میں اٹھے تھے ———— سرہانے ان کی چھوٹی لڑکی سلمہ بیٹھی تھی ۔ رحیمو چا گھر کے وفادار ہی نہیں تھے بلکہ اب تو خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے ان کی گنتی ہوتی تھی...... پشت در پشت ان کا خاندان اس گھر کا وفادار رہا تھا ۔ رحیمو چا کے ہاتھ دعا میں اُٹھے تھے ۔ ابی حضور کی آنکھیں لگ چکی تھیں ۔ امی حضور کی پلکوں پر اب بھی خوف کا ساون ٹھہر ٹھہر کر برسے جا رہا تھا ۔

کریم بیگ کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں ۔ کتنا عرصہ بیت گیا — ایک طویل مدت گزر گئی ۔ زمانے کی خون آلودہ ہتھیلیوں پر سُرخ گلاب کی تمنا کرنے والوں کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا...... ان کے معصوم سراپے سے ہو کر آزادی کا ایک ہلکا سا خوشگوار جھونکا آیا اور تیزی سے گزر بھی گیا ۔

تو حال یہ تھا کہ شہر آگ میں جھلس رہا تھا...... اور ریڈیو چیخ رہا تھا......
سارے شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے...... باہر نکلنے والے کو گولی مار دی جائے گی ۔

ابی حضور ظفر بیگ بستر مرگ پر لیٹے لیٹے اب بھی ہذیانی کیفیت میں چیخ رہے تھے — اسی حق کے لئے جنگ کی گئی تھی...... سب لڑکٹ کے مرجاؤ مارو...... مارو......

ابی حضور، وہ گھبرائے انداز میں بولا...... پولیس نے بلوائیوں پر قابو پا لیا ہے ۔ یہ جرائم پسند لوگ ہیں ابی حضور...... مذہب سے انہیں خدا واسطے کا بیر ہے ۔ شہر

میں اب امن ہے ابی حضور...... لڑائی ختم ہو گئی ۔

ظفر بیگ کی سانسیں جیسے اُکھڑ رہی تھیں ۔ لڑائی ختم کہاں ہوئی ۔ ابھی سے لڑائی کی شروعات ہو گئی ۔ ہم تو وہ برا وقت دیکھنے کو نہیں رہیں گے ۔ مگر تم رہو گے...... اللہ بچائے...... یہ بدبو کا بیج بو کر اچھا نہیں کیا ظالموں نے...... یہ لڑائی جاری رہے گی ۔ لڑائی مسلسل جاری رہے گی ۔ خدا بچائے...... خدا تمہیں محفوظ رکھے...... آمین

وہ لوگ ایک عہد کا ترجمان ہوتے ہیں ۔ جن کے آنکھیں موندتے ہی ایک دور ختم ہو جاتا ہے ۔ ایک دوسرے دور کی شروعات ہو جاتی ہے ۔

ابی حضور ایک ایسے ہی عہد کے ترجمان تھے ۔ چھوٹی سی لڑائی سے گھبرا گئے ۔ آنکھیں موند لیں ۔ مرتے وقت قرآن شریف کو سینے سے لگایا...... اشارے سے کہا ۔ حفاظت کرنا اس کی...... رئیسی تو چھن گئی ۔ زمینداری انگریز لے گئے ۔ باقی یہی بچا ہے ۔ سو سہیج سنوار کر احترام سے رکھنا...... ہم تو چلے...... اب تم باقی ہو...... کہ عمر کا ایک لمبا حصہ دیکھنا ہے ۔ تمہیں...... جا تو رہا ہوں...... مگر ایک کسک لے کر جا رہا ہوں...... کہ آزادی کا جو خوب صورت خواب ہم نے مل کے دیکھا تھا، وہ خواب لہولہان ہو گیا...... اب واپسی ہے...... کہ یہاں سے جی ٹوٹ گیا ۔ پس اُس کی نگہبانی میں جا رہا ہوں......

پھر آنکھیں موند گئیں...... ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ۔

امی حضور دہاڑ مار کر رونے لگیں — وہ بھی خاموش تھا ۔ یہ عقل و شعور میں نہ تھا کہ سب اتنی جلدی ہو جائے گا ۔ اتنی جلد ابی حضور کی آنکھیں موند جائیں گی...... اور ذمہ داری کا بوجھ اُس کے ناتواں کندھے پر آ جائے گا ۔

امی حضور دہاڑیں مارے رو رہی تھیں...... بیٹا! لہولہان آزادی کا غم کھا گیا تیرے ابی کو چپ ہو جا......

آنسو خشک ہوئے...... آنکھیں باہر اُبل آئیں...... مٹھیاں کس گئیں ۔ جیسے

شکوہ کر رہی ہوں۔اسی آزادی کا خواب دکھاتے تھے مجھے— نوج ،یہی مار کاٹ
دیکھنے کو رہ گئے ہم......

محلے کے لوگ پہنچے — پنڈت رما کانت بھی آئے ...... سب کی آنکھیں
بوجھل۔جھکی جھکی سی...... پنڈت جی نے ایک لمبی سانس کھینچی اور جیسے ٹکڑے ٹکڑے
الفاظ جوڑے...... یہ ٹھیک نہیں کیا تم— چلے گئے نا اکیلے اکیلے...... مجھے کون سا دن
دیکھنے چھوڑ گئے تم......ساتھ لے کے چلتے......غم تو بہت بڑا ہے کہ اب ہولی میں کون
گلا لگائے گا مجھے......محبت کے ابیر اب کون ڈالے گا......؟ بچوں کو دیوالی کے پٹاخے
کے پیسے تو میں دے دوں گا......مگر وہ تمہاری راہ تکیں گے ظفر...... کہ اب تمہاری جگہ
کوئی نہیں آئے گا...... یہ جگہ اب کوئی نہیں لے گا...... کہ یہ فرق کی دیوار تمہارے بعد
اونچی اٹھتی چلی جائے گی......

رحیمو چا بھی سر جھکائے تھے......ٹپ ٹپ آنسو گرتے جا رہے تھے......سلمہ
بھی چپ تھی......اور حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

پھر آوازیں کھو گئیں......کھوتی چلی گئیں......اور ویرانی گھر کے ہر طاق پر
قابض ہو گئی۔ایک دن رحیمو چا اور سلمہ بھی چلے گئے۔کہ اب یہاں کوئی نہ رہا......گھر
کی دیواروں سے غم برستا ہے......سو یہاں دل نہیں لگتا......

وقت کی کروٹ مشہور ہے...... کیسے کیسے لشکر تہہ و بالا کر دیئے...... وقت
قارون پر بھی ہنسا۔نمرود پر بھی ہنسا......اور آج پھر وقت کے قہقہے چودھری ولا کی ویرانی
میں گونج گئے......

یہی رحیمو چا......جنہیں گھر کی ویرانی کا غم نگل گیا تھا۔ایک دن واپس لوٹ
آئے۔آئے تو خالی ہاتھ......آنکھیں سوجی ہوئیں......تھرتھراتے ہونٹ نے آہستہ سے
لفظ کی ادائیگی کی......تم نے سلمہ کو دیکھا ہے...... یہاں سلمہ تو نہیں آئی......نہیں آئی......؟

دفعتاً جھنگر چیخے......آنکھوں میں ننھی سی جان کی شوخیاں کوند گئیں......اور
سوکھے ہونٹ بس اسی قدر کہہ سکے...... جاؤ...... جا کے تلاش کرو......اس سے پہلے کہ
وقت کا ہاتھ سلمہ کو آگے بڑھ کر اٹھا لے......اُسے پالو— تلاش کر لو......

رحیمو چا نڈھال پریشان سیڑھیوں سے دوڑتے ہوئے چلے گئے اور پہلی بار
کریم بیگ نے سوچا......اس سے پہلے کہ وقت اُس کی شکست پر قہقہہ لگائے، اُسے
روزی روٹی کی تلاش کرنی چاہئے کہ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے......

اور یہ مسئلہ اس وقت صرف کریم بیگ کا ہی مسئلہ نہ تھا بلکہ کریم بیگ کی طرح
بہت سے دوسرے نوجوانوں کے سامنے بھی یہی مسئلہ آ کھڑا ہوا تھا۔اور پہلی بار کریم
بیگ کو احساس ہوا کہ ابی حضور کا ماتم گھر میں دو روٹیاں نہیں لا سکتا۔دن رات کی تھکن
اور لمبی دوڑ دھوپ کے بعد ایک شام جب وہ تھکے ہارے گھر آئے، نوجوانی کے کندھے
سے ٹپ ٹپ خون بہہ رہا تھا۔اور کھردری ہتھیلیوں پر فتح کی لکیریں مسکرا رہی تھیں......

ابی حضور کی موت کے بعد یہ پہلا فخریہ احساس تھا جو اُس کے اندر پیدا ہوا۔
کہ اب وہ کمزور نہیں رہا۔اُس نے اس برے وقت میں کام ڈھونڈ لیا ہے۔اب دو
روٹیوں کا بندوبست کوئی مشکل بات نہیں رہی۔مگر اب بھی بچپن کی وہ رئیسانہ فطرت
رہ رہ کر ایک خلش بن کر دل میں چبھ جاتی...... وہ شان...... وہ جلال...... چودھری
خاندان سے وابستہ کہانیاں......وہ اُٹھا ہوا سر اب بھی ٹھہر ٹھہر کر ایک بے چینی پیدا کر رہا
تھا......مگر خود مختاری کی پھڑکتی مچھلیوں کا احساس ان تلخیوں پر غالب آ جاتا...... پھر یہ
تلخیاں بھی آہستہ آہستہ نقش بر آب کی طرح دل و دماغ سے نکلتی چلی گئیں......

وہ زندگی کے ایک نئے دور میں قدم رکھ رہا تھا۔اِدھر اُدھر کی ملازمت سے
آفس تک کا سفر خاروں بھرا سفر رہا۔مگر اس سفر میں اب رضیہ اُس کی شریک حیات
تھی۔امی نے جیسے لفظوں سے ناطہ ہی ختم کر لیا تھا......اور پھر ایک دن اُن کی آنکھیں

ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔اور یہی فقرہ ان کے لب کو ابدی خموشی دے گیا...... کہ نوج آزادی ملی بھی تو پہاڑ ساغم دے گئی۔

پھر یہ آواز ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گئی ...... چودھری ولا اداس ہو گیا—
خاموشی اور ویرانی کے جھینگروں نے گھر میں ڈیرا ڈال دیا۔رشتے محبت کی بنیاد ڈالتے ہیں......اور محبت کے لمحے ایک تاریخ بن جاتے ہیں......آنسو تھمے تو رضیہ کی محبت بھری آغوش سہارا بنی......اور سب کچھ یاد آیا......گزرے ہوئے ایک ایک تاریخی لمحے......امی حضور کو اللہ پاک سے صحت دلانے کی کتنی دعائیں کیں......مگر سب بے سود......جیسے دعاؤں نے اپنا اثر کھو دیا تھا۔

تو پہلی بار......وہ جو قادر تھا......جو پیدا کرنے والا تھا۔وہ اُس کے شک کی وجہ بن گیا......کہ امی حضور کی تربت کے قریب اُس کے آنسو تھمتے نہ تھے......تیری زندگی کے لئے تسبیحوں کے کتنے دانے گن ڈالے میں نے......مگر تو اثر سے عاری رہا...... طاق پر رکھے ہوئے قرآن شریف کی گرد جھاڑی......بند سانسوں کے کثیف جھونکوں کو باہر نکالا۔
پھر بھی تو خوشی سے محروم کر گیا......نوجوانی کے کندھے کو پہاڑ ساغم دے کر جھکاتا چلا گیا۔
اور جب کوئی گھاؤ بھرنے کے قریب ہوتا تو پھر ایک نیا زخم بھر دیتا ہے—

امی حضور! تم اس گھر سے نہیں گئی ہو۔تم اس گھر میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہو گی......اپنی بلند آواز میں ......اپنی شفقت میں......اپنی خاموشی میں......تم زندہ رہو گی......ابی کی موت کے بعد تم نے ایک دن بھی اپنے جھری بھرے ہاتھوں میں تسبیح نہیں اٹھائی کہ اس کے دانوں کو چھونے کا احساس تمہارے اندر گزرے ہوئے وقت کی آندھی کو صدا دیتا تھا......تم اس شکستہ ولا کی ایک ایک اینٹ میں......ایک ایک شئے میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہو گی۔

اور ابھی یہ آنسو خشک بھی نہ ہوئے تھے کہ اچانک وہ ٹھٹھک کر رُک گیا۔

عقب سے ایک تیز قہقہہ گونجا تھا...... وہ چونکا......قہقہہ تیز تر ہوتا گیا......اُس نے معلوم کیا۔قہقہے کا یہ راستہ اس کے آفس میں آکر ختم ہو جاتا تھا۔

اور اُس نے سوچا...... یہ نقرئی قہقہے کتنے خوبصورت ہیں۔جو گزر گیا اُسے بھول جانا چاہئے......نقرئی قہقہے اُسے اپنی جانب بلا رہے تھے......

اور وہ حسین جنت کی تلاش میں اُن قہقہوں کی جانب بڑھا جا رہا تھا......

(۳)

آفس میں قہقہے گونج رہے تھے— کرسیوں پر رنگین خواب انگڑائیاں لے رہے تھے......تال ٹھونکے جا رہے تھے......گفتگو کے حسین چشمے پھوٹ رہے تھے...... صاحب کی آنکھوں سے روشنی کی دھاریں بہہ رہی تھیں...... آفس کی کھڑکیوں اور دروازوں سے خوشبو کے آبشار گر رہے تھے......

کہ جو بھی دیکھتا وہ اپنی جگہ ٹھٹھک کر ضرور کھڑا ہو جاتا......کہ جو بھی دیکھتا اس کی آنکھیں ان مناظر کی قیدی بن جاتیں......

طلسم ہوشربا کی حسین عورت کو پلٹ کر دیکھے جانے والا منظر بت بنا دیتا......
کریم بیگ نے دیکھا اور جیسے ماحول کے سحر میں گرفتار ہو گیا......ان خواب منظروں کے حوالے کر دیا......کہ اب پیچھے لوٹنے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ہنسی قہقہوں میں یہ بوجھل زندگی راست پر آجائے گی۔جو دھواں ماضی نے انڈیلا ہے......وہ تلخیاں دور ہو جائیں گی ...... وہ تلخیاں خوب صورت خواب اور رنگینیوں سے پر فضا میں گم ہو جائیں گی......اب گزرے ہوئے کا شکوہ بھی کیا......اب تو آگے کی خوبصورت اور حسین ترین زندگی پر سرخم کرنا ہے......

سوسر جھکایا......آنکھیں پھیلائیں......

اور یہ خواب خواب منظر کریم بیگ پر آہستہ آہستہ اپنی گرفت مضبوط کرتا گیا......اس طرح کہ اسے کچھ پتہ بھی نہ چلا......اور وہ ڈوبتا چلا گیا۔

قہقہوں کے بیچ کچھ واہیات شور بھی تھے......کچھ گندی باتیں بھی تھیں......

رتھ اور سموئل کی جما دینے والی ہنسی بھی تھی...... یہ رشتے اور مذہب پر بے باکی سے خوفناک تبصرے کیا کرتے تھے—

ایک ڈوبتا ہوا سورج اس کی نگاہوں میں کوندا...... اور وہ آہستہ سے بڑبڑایا......شیطان......ترقی کے ہر ایک زینے پر شیطان کھڑا ہنس رہا ہے......فنکشن میں— آفس کی تقریبات میں......مسز بھٹنا گر کے گھر پر......فائیو اسٹار ہوٹل میں......

رتھ اور سموئل میں...... ہر جگہ شیطان چھپا تھا......جو قہقہہ لگا رہا تھا......

اور پہلی بار رنگینیوں سے کٹ کر اُس نے محسوس کیا۔

یہ...... یہ شیطان کی اولاد میں سے ہیں...... یہ...... جو موقع پا کر ہر جگہ اپنی گفتگو تیز کر دیتے ہیں تا کہ دوسرا ان کی بے ہنگم آواز کی زد میں آجائے اور نقرئی قہقہوں میں ڈوب جائے......اور ان جیسے لوگوں نے ''بھوک'' کو اپنی گفتگو کا موضوع بنا رکھا ہے...... کہ بھوک کی زد میں آ کر رشتے کے محل ڈھے جاتے ہیں......جسم کی شناخت کھو جاتی ہے...... ہوس کے ناگوں کا زہر آہستہ آہستہ اثر دکھاتا ہے اور ایک نئی دُنیا کا تصور نوخیز پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا ہے......

ہاں...... یہ اُسی دن کے منتظر ہیں......

اُسی دن کے منتظر ہیں...... جب رشتے، رواجوں......اور مذہب کے میل کو جھاڑتا ہوا انسان سارے بندھنوں سے آزاد ہو کر پھر سے آدمی مانو بن جائے گا......

پھر سے پاشان یگ میں لوٹ جائے گا......

تہذیب کی گرد گرد اُڑ جائے گی......

نشہ حواس چھین لے گا......گانے کے شور بے تعلق بنا دیں گے......تا کہ......

وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں—

اِس زہریلے سیلاب میں تم بھی ہو......تم بھی ہو کریم بیگ......!

جب یہ آوازیں ابھریں تو وہ زور سے چونکا...... کہ خود بھی وہ اس سیلاب میں بہتا ہوا بہت دور تک نکل گیا تھا......سیلاب کی آوارہ لہریں اُس کے جسم پر برق بن کر گر رہی تھیں ...... رفتہ رفتہ وہ معمول میں لوٹا......نظریں کارنس سے جھولتی میلی تسبیحوں پر جم گئیں۔ طاق پر گرد و غبار کے درمیان رکھے قرآن شریف کو دیکھا......مگر اب وہی خوف و دہشت کا سانپ پھن اُٹھائے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا......اور ہٹتا ہی چلا گیا......

اور اس کی زندگی میں ایک بالکل نئے صفحے نے انگڑائی لی— کہ اچانک کسی کے ٹکرانے سے وہ چونکا......اور آنکھیں پھیلتی چلی گئیں......

ٹائپ رائٹر مشین پر رینگتے ہوئے اُس کے ہاتھ ٹھہر گئے ......اُس کے اندر برسوں سے دبا ہوا ایک گمشدہ نام اُبھرا......سلمہ......

سفید ساڑی میں ملبوس......ہونٹوں پر جھولتے ہوئے خاموشی کے تالے۔ کسی بیوہ جیسی اداس ......جسم کی وادی میں تجربوں کے ہزار آبلے گواہ تھے......اُس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سفید کاغذ اُس کی جانب بڑھایا......جس پر مدد کی درخواست تھی ......کچھ لوگوں کے نام بھی درج تھے......جن لوگوں نے اُس کی پاگل کر دینے والی جوانی پر رحم کھا کر کچھ پیسوں کی خیرات کی تھی۔ چند لمحوں تک وہ شد بد کھو کر دیکھتا رہ گیا۔ پھر ٹھنڈے، لرزتے ہاتھوں سے کاغذ تھام لیا......کانپتی نظریں کبھی کاغذ......کبھی اُس کے چہرے کا جائزہ لیتیں۔ ہونٹوں کے پرندے کو آواز دینا چاہا تو وہ گویائی سے محروم

ہوکر فضا میں پرواز کر چکے تھے......

وہ جیسے اپنے چہرے کے، نہیں سمجھ میں آنے والے رنگوں کے ساتھ بوسیدہ کاغذ کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ وہ اب بھی پرسکون اس کے سامنے کھڑی تھی۔ آنکھیں جیسے زندگی کا زہر پی کر آزاد ہو چکی تھیں۔

کرسیوں پر بیٹھے ہوئے آفس کے لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں۔

کچھ لوگ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے—

''بیچاری— صاحب سے ملانا چاہئے— صاحب ہی اس کا پرابلم سولو کر سکتا ہے۔'' ''آؤ......آؤ ہمارے ساتھ......''

کچھ لوگ آگے آئے......اور وہ ایک لاش کی طرح اُن کے ساتھ ساتھ ہو لی— وہ چپ، بے جان سا دیکھتا رہا......پھر وہ اپنی سوچ کے بادلوں پر سوار بہت دور نکل گیا...... جب لوٹا تو معلوم ہوا......کہ اب سلمہ مس نیلی بن چکی ہے......صاحب نے جوانی پر رحم کھا کر اس اسے بھی نوکری دے دی ہے......صاحب کو یقین ہے...... مس نیلی سب کچھ بہت جلد سیکھ جائیں گی......

پھر وقت پر لگا کر اُڑ گیا—

وہ دیکھتا رہا......مس نیلی تبدیلیوں کے پراسرار پل سے گزر رہی ہیں۔ پرانی پہچان کے زیور نکال کر نئے زیور ڈال رہی ہیں۔ کبھی سیلولس بلاؤز میں......رنگین ساڑیوں میں، کبھی اسکرٹ اور شرٹ میں، کبھی گھائل کر دینے والی شلوار اور جمپر میں۔ کبھی دعوت نظارہ دیتے ہوئے کپڑوں میں ...... وہ صاحب کی منظور نظر تھیں اور صاحب کو پورا پورا اختیار تھا کہ وہ جو سلوک چاہیں مس نیلی کے ساتھ کر سکتے ہیں—

مس نیلی سے اُس کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ مگر سلمہ اُس کی بہن تھی......اور یہی احساس برسوں سے دبے آتش فشاں پہاڑ کو سلگنے کا موقع دے رہا تھا۔ وہ یہ سب کیسے

گوارہ کرتا کہ کیکٹس نظریں اُس کے معصوم جسم پر چبھتی رہیں...... مس نیلی آفس کی منظور نظر ہو گئی تھیں۔ اس کے قہقہے آفس کی شان بن گئے تھے......اُس کی مسکراتی آنکھیں ایک خوبصورت افسانہ بن گئی تھیں......اس کی زندہ دلی کا چرچا ہر خاص و عام کی زبان پر تھا......اور وہ......کھویا کھویا کبھی کبھی اُس میں مرحوم رحیمو چا کے عکس کو ضرور تلاش لیتا جو اس کے گھر کے وفادار ہی نہیں بلکہ ایک اہم رکن بھی تھے......

وہی رحیمو چا......

آج مس نیلی کے نئے چہرے میں گم ہو گئے تھے—

صاحب نے مس نیلی کو ایک کوارٹر بھی دیا تھا......صاحب اور مس نیلی کے تعلق کی عجیب عجیب خبریں اُسے روز موصول ہوتیں......اور روز ایک نیا کیکٹس اس کی ہتھیلیوں پر اُگ آتا......ایک دن جب رحیمو چا اُسے بہت یاد آئے تو اُس دن مس نیلی اچانک اُس کے لئے مرگئی......آخر کار اُس نے سلمہ کو پکڑ ہی لیا، جو بس اسٹینڈ کے قریب کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔

سلمہ نے نگاہیں اٹھائیں اور آہستہ سے مسکرادی......

وہ چند لمحوں تک کھوئی کھوئی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا......پھر پوچھ ہی ڈالا......

تم سلمہ ہونا......

اچانک جیسے زمین ہل گئی......زلزلہ آگیا......مس نیلی کے جسم میں لرزش ہوئی......آنکھوں میں خوف چھا گیا......تم......تم......؟؟

اُس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں......

''ہاں......میں'' اُس نے نظریں جھکالیں......پھر کہا......''کچھ پوچھوں تو جواب دوگی؟''

مس نیلی نے ایک لمبی سانس لی......خود پر قابو پایا......الفاظ جوڑے......
پھر ڈھٹائی سے بولی...... ہاں تمہیں پہچان گئی...... تمہیں اُسی دن پہچان گئی تھی۔مگر تم
مجھے نہیں پہچاننے کا کیا لو گے......؟

اس کی جلتی آنکھیں جیسے گرم سلاخوں کی طرح جسم میں اُتر گئی تھیں۔اور جیسے
ایک گونگے رشتے نے سوال کیا......''یہ تم کیا کہہ رہی ہو سلمہ......''

''میرا نام مس نیلی ہے''

وہ پھر تلخی سے بولی......اور سنو......میرا کسی بھی مذہب سے کوئی واسطہ نہیں
ہے...... یہ نام نہ ہندو کا ہے نہ مسلمان کا...... یہ نام باس کی پسند کا نام ہے۔اس لئے یہ
نام مجھے پسند ہے......

کریم بیگ کے حواس پر جیسے بجلی گر پڑی......اب پوچھنے کے لئے باقی ہی
کیا تھا۔اب کیا پوچھتا......بچپن میں گم ہوئی ننھی منی سلمہ نے بازاروں،شاہراہوں،
گلیوں میں در بدر خانہ بدوشوں کی طرح گھوم پھر کر اپنی شرم بیچ دی تھی......اور وقت
شاہراہ پر سجنے والا ایک خوبصورت مجسمہ بن گئی تھی......

بس آ گئی— مس نیلی نے خوبصورت بیگ کو حرکت دیا۔زہریلی نظروں
سے اس کی جانب دیکھا......اور آخری بچی گولی بھی اس کے جسم میں داغ دی......''اور
ہاں سن لو کریم!رحیمو چا کی لڑکی سلمہ تمہاری بہن تھی۔مس نیلی تمہاری بہن نہیں ہے۔''

بس سیٹی بجاتی ہوئی سامنے سے گزر گئی......وہ دیر تک اڑی ہوئی گرد میں
اپنے شکستہ حواس کے ساتھ کھڑا رہا......سلمہ ملی بھی تو اس حال میں جبکہ سلمہ مر چکی تھی اور
مس نیلی کا جنم ہو چکا تھا......

رشتے کے محل کیا اتنی جلد بکھر جاتے ہیں—

اندر ہزاروں چیونٹیاں سرسرا رہی تھیں ...... ہاں ...... ہاں بکھر جاتے

ہیں...... جہاں تمہارے جیسے لوگ ہوں گے کریم بیگ...... جو صابن کے جھاگ کی
طرح بکھیر دیں گے رشتے کے احساس کو......نئی آزادی کے نئے احساس سے غسل
کریں گے۔ڈسکو کے سروں پر آزادانہ رقص کریں گے......تو آنکھیں پھیلتی جائیں
گی......پھیلتی جائیں گی۔اور رسم و رواج کی مضبوط قدیم دیواریں گرتی جائیں گی۔
گرتی جائیں گی۔

اور ایسا کر کے ہم ہمالیہ کی کسی نئی چوٹی پر فتح کے پرچم نہیں لہرائیں گے......
ہم بلند اور قد آور نہیں ہو جائیں گے...... بلکہ عزت اور شرافت کی برسوں پرانی دیوار
گرانے کے مجرم ہوں گے—اور زوال کے قریب تر ہوتے جائیں گے۔سچ صرف
ہماری تہذیب ہے......باقی سب ڈھونگ ہے......

بوجھل قدموں سے کریم بیگ گھر لوٹے......کانپتی آنکھوں سے گرد آلود
تسبیحوں کو دیکھا......احساس میں ہلچل مچی......اور وہ زاروں قطار پھوٹ پھوٹ کر
رو پڑے......

(۴)

صبح جاگے تو طبیعت ہلکی تھی......اندر کے سوئے ہوئے پرندے کو جگانے
کے لئے خاصہ جوکھم اٹھانا پڑا۔کریم بیگ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتے رہے......
اتنے برسوں میں ان کی زہریلی سوچ کی بدولت بستر پر آگ ہی آگ جمع ہو گئی تھی۔
اس آگ کو بھی سرد کرنا تھا اور یہ کام اتنا معمولی اور آسان نہ تھا......کریم بیگ کو اپنی
کمزوریوں کا احساس بھی خوب تھا......ابی حضور ظفر بیگ اور امی حضور کے انتقال کے
بعد وہ ٹوٹتے ہی چلے گئے تھے......نوجوانی کے کندھوں پر جب زخموں کے ان گنت
نشانات دیکھے تو کمزوریوں کی دلدل میں اترتے چلے گئے اور منطق کے اونچے

مینارے پر چڑھ گئے ...... کہ آزادی نے کیا دیا سوائے زخموں کے ...... مذہب نے کیا
دیا سوائے بے بسی کے ...... کمسنی میں ہی ماں باپ کی شفقت کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔تو
ایسی صورت میں تسبیحیں بھلا کیسے گرد آلود نہ ہوتیں ......

مگر، مدت مدید کے بعد ایک سریلی آواز ان کے اندر گونج رہی تھی۔تسبیحوں
کی گرد ہٹائی جاسکتی ہے۔قرآن شریف کی دھول جھاڑی جاسکتی ہے......اور کریم بیگ
کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں ......آفس کی سالانہ تقریب کا وہ جشن یاد آیا۔جب وہ اپنی
کمزوریوں کے غلام بن گئے تھے۔تو وہی صدا غصے میں پھنکار رہی تھی۔

تم بے حیائی کے بلند ترین مینارے پر چڑھ گئے ہو کریم بیگ۔

کیا اتر سکو گے......؟

اور بدلے میں ان کی آواز کانپ گئی تھی......میں بہت کمزور ہو گیا ہوں......
ہاں یہ سچ ہے کہ میں بہت کمزور ہو گیا ہوں اور یہ سب اب اچھا بھی نہیں لگتا......مگر میں
ایک ہلکی سی مدافعت بھی نہیں کر سکتا۔

کریم بیگ جب سو کر اٹھے تو صبح ہو چکی تھی......جانے کیوں آج ایسا محسوس
ہوا جیسے دل و دماغ سے ایک بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔نپے تلے قدموں سے چلتے
ہوئے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔خیریت دریافت کی۔

انجم کے لئے بھی یہ سب کچھ نیا تھا......لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔مگر یہ ضرور
محسوس کیا کہ ابا میں بڑی عجیب سی تبدیلی آ گئی ہے، برش کرتے ہوئے وہ ٹکڑے
ٹکڑے خیالات میں کھو گیا......ابا تو ایسے کبھی نہ تھے۔پھر......شاید ابا کو برسوں بعد
آج اپنے بوڑھے ہونے کا احساس جاگا ہو۔یا پھر وہ اب تک کئے گئے گناہ کا ازالہ کرنا
چاہتے ہوں مگر گناہ کیسا......؟

اُدھر کریم بیگ رضیہ سے مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''رضیہ! ایک مدت گزر گئی ......ایک طویل مدت ......اب جا کے احساس
جاگا ہے کہ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں——اب اپنے طور طریقے بدلنے ہوں گے......رضیہ
سچ کہوں تو یہ سب مجھے کبھی اچھا نہ لگا۔تم اسے ایک طرح کا انتقامی جذبہ بھی کہہ سکتی ہو
......یہ انتقامی جذبہ جیسا بھی رہا ہو......میرے اندر اندر داخل ہو گیا تھا......اور یہ سب
کچھ ...... جو میں آج تک کرتا رہا...... یہ سارے طور طریقے ...... جو میں نے خود پر
تھوپے......تمہیں سکھانے کی کوشش کی......اور انجم نے سیکھے جس کا اس گھر میں چلن رہا
......وہ بھی محض ایک انتقامی جذبے پر مبنی تھا......تم پوچھو گی کیا انتقامی جذبہ تو سنو......

آزادی کے بعد ہم نے کوئی خوشی نہیں دیکھی۔کوئی دن ایسا نہ گزرا جب تنگی
داماں کا مسئلہ نہ آ کھڑا ہوا ہو۔غدر کے بعد سے ہم لٹتے ہی چلے گئے۔پہلے تخت
گیا......پھر تاج اُترا......رئیسی گئی......زمینداری ختم ہوئی......اور زوال مقدر میں
لکھ دیا گیا...... ہاں رضیہ......ہاں شاید یہی انتقامی کاروائی تھی کہ ہماری مقدس کتابیں
ہم نے غصے میں طاق پر سجا کر رکھ دیں......اور اس پر بھی بس نہ چلا تو وہ سارے
کارہائے نمایاں انجام دیے جن پر شجر ممنوعہ کا فتوی صادر تھا......اس طرح اپنی ناخوشی
کا انتقام لیتا گیا......انجم نے اسی ماحول میں پرورش پائی۔تم نے اسی ماحول میں اپنے
ہونٹوں کو ایک طویل چپ دے دی اور مصنوعی جنت کا اسیر ہو کر رہ گیا......

مگر رضیہ......اب......اب اس غلطی کا احساس ہو چلا ہے۔اب میں اس ماحول
سے باہر نکلنا چاہتا ہوں......تمہیں بھی......انجم کو بھی اس ماحول سے نکالنا چاہتا ہوں......

کریم بیگ بغیر ٹھہرے بولتے ہی چلے گئے۔

جیسے برسوں کی دبی آواز نے باندھ توڑ دیا ہو......اور جذبے کا سیلاب
اچانک اُمڈ آیا ہوا۔

رضیہ کھوئی کھوئی آنکھوں سے اُنھیں دیکھتی رہی......اُس کے ہونٹ آہستہ

سے کانپے اور صدا تھرتھرائی......

''آج آزادی کا حق دیا ہے تم نے مجھے......''

آنکھیں جیسے جل رہی تھیں...... ''میں نے تو ہمیشہ تمہارا ساتھ دیا ہے......تم جس راستے پر لے چلے میں اُسی راستے پر گونگے جانور کی طرح تمہارے پیچھے پیچھے چلتی گئی......تم جہاں جہاں ٹھہرے۔ میں ٹھہرتی گئی......مگر انجم تو نئی نسل کا ہے نا......تم نے جس نئے راستے کی بے اصول پگڈنڈی پر اسے چھوڑ دیا ہے۔ کیا وہ پھر سے صحیح مقام پر واپس آسکتا ہے......بولو......

کریم بیگ کی آنکھیں جھکتی چلی گئیں......وہ کچھ بولے نہیں۔ رضیہ کی بات جیسے اُن کے دل کو چھو گئی تھی......کہنا چاہا......کہ ہاں رضیہ۔ تم ٹھیک کہتی ہو......اگر انجم کسی غلط راستے پر نکل گیا ہے......تو اُس کا قصوروار میں ہوں...... کیونکہ خود میں ہی بہت دیر میں جاگا...... جب انجم نے میری ہی بے اصول پگڈنڈی پر اپنا محل تعمیر کر لیا تھا۔

کریم بیگ کی آنکھوں میں وقتی طور پر دھواں سا لہرایا۔ اگر انجم اپنے اصولوں کی بلند چٹان پر کھڑا ہے۔ تو اس کا قصوروار کون ہے۔

وہ......اُس کا غلام ملک......یا انجم کا آزاد ملک......؟

اور پھر سب کچھ آنکھوں کے آگے دوڑ گیا کہ وہ سارے لمحے ایک تاریخ بن کر اس کے اندر جذب ہو چکے تھے......وہ ہیبت اور ڈر کا ماحول......گھر کے آنگن میں چھایا ہوا وہ ہولناک سناٹا......ابی حضور ظفر بیگ کی بلند بانگ......آزادی آزادی کی نہیں تھکنے والی زبان......۴۸ء کی وہ شب آشوب......قربانیاں......اور ہمیشہ کے لئے خموش ہوئے لب......اور ایسے کتنے ہی خوفناک منظر اُس کی نگاہوں میں گھوم گئے......

اور باقی بچے اُس کی نسل کے بے عقیدہ لوگ...... وقت کے ستائے ہوئے لوگ......

ان ستائے ہوئے لوگوں کی صف میں کشکول لے کر وہ بھی شامل تھا......اور زہر کی جلی بھنی روٹیاں ایک ایک کر کے انجم کے ہاتھ میں دیتا جا رہا تھا......اور انجم کی آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ پھیلتی جا رہی تھیں......

اور ایک نظر نہیں آنے والا سانپ انگڑائیاں لے رہا تھا۔

اور بات تو بس کل ہی کی ہے کہ چھوٹا انجم دیواروں کے بیچ خوف سے دبکا ہوتا......آنکھیں دہشت سے زرد معلوم ہوتیں......تناؤ، اور تبدیلی کی جگہ اس کا اپنا شہر ہوتا۔ جہاں فساد کے دن ہوتے......تناؤ کی راتیں ہوتیں۔ بوالیوں کے چنگھاڑتے شور ہوتے...... جلتے ہوئے مکانات سے اٹھتے ہوئے واویلے اور دھویں ہوتے...... دل ہلا دینے والی معصوم چیخیں ہوتیں......

وہ بھی اپنے گھر کے سارے دروازے بند کر دیتا...... کھڑکیوں پر کنڈلیاں لگا دیتا۔

خوف سے کونے میں دُبکا ہوا انجم ایک سوالیہ نشان بن کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا......

ابی......یہ کون لوگ ہیں ابی......

ابی......یہ ہماری طرح معصوم بچوں کو کیوں مارتے ہیں......

ابی......یہ لوگ گھر کیوں جلاتے ہیں۔ ابی......

ابی......کیا انہیں ایسا کرنے سے روکنے والا کوئی نہیں ہے۔

کوئی نہیں ہے......تم کیا ہم بھی ایسے ہی مارے جائیں گے ابی......

اس کی آنکھوں میں نفرت ہی نفرت ہوتی......نفرت کی تیز لپٹیں نکل رہی ہوتیں......وہ ان معصوم سوالوں کی تاب نہ لا کر سر جھکا دیتا اور رضیہ ٹھیک امی حضور کی طرح دوسری جانب منہ پھیر کر آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگتیں......اور

ایسے میں ابی حضور ظفر بیگ سامنے آکر کھڑے ہوجاتے......

...... جنگ ختم نہیں ہوئی بیٹا! میں دیکھ رہا ہوں ...... جنگ جاری ہے......
مسلسل جاری ہے......

کریم بیگ نے امڈ آئے آنسوؤں کو ضبط کیا......رضیہ کی جانب دیکھا......
چہرے کی مٹتی مٹتی لکیروں کا جائزہ لیا۔اور پھر جیسے خود کلامی میں مصروف ہوگیا۔

رضیہ......اب بہت تھک گیا ہوں رضیہ۔

اب یہ تھکن اوڑھ کو سوجانے کی خواہش ہوتی ہے......

تم دیکھنا رضیہ......قرب وجوار سے بدبو کا ایک بھیانک سیلاب اٹھے گا......
اور آسمان پر آدم خور گدھ چھا جائیں گے......

برسوں بعد آج انجم کی منطق پر پیار جاگ رہا ہے......قصوروار دراصل یہ
ماحول ہے رضیہ......جس نے ایک بھی کھلی آنکھ والا پیامبر نہیں دیا......

ایک بھی کھلی آنکھ والا پیامبر نہیں دیا......

کریم بیگ نے ایک گہری سانس لی۔

رضیہ نے جب یہ حالت دیکھی۔تو اپنی تھکن اُتار کر جبراً ہونٹوں پر مسکراہٹ
طاری کی......اور کریم بیگ کی طرف مصنوعی غصے سے دیکھتے ہوئے بولی......

''دیکھ رہے ہیں ...... کمرے میں کتنی گرد ہے ...... یہ گرد ہم سب کو مل کر
صاف کرنی ہوگی......

کریم بیگ اچانک مسکرا دیئے اور رضیہ کے ساتھ کمرے میں داخل
ہوگئے......پھر ایسا لگا جیسے اندر ہوا وزنی پتھر آہستہ آہستہ ہٹتا جا رہا ہو۔

جب سے کریم بیگ نے اپنے اوپر کی گرد جھاڑی تھی۔سلمہ کے طور طریقے
ان کی نگاہوں میں چبھنے لگے تھے۔مس نیلی سے اُنہیں کوئی شکایت نہیں تھی......مگر سلمہ

سے شکایت ہی شکایت تھی ......سب سے زیادہ غم تو اس بات کا تھا کہ وہ آزادی کے
متوالے رحیمو چا کو فراموش کر بیٹھی تھی...... جب چھوٹی سی سلمہ پھدکتی ہوئی سارے گھر
میں دوڑا کرتی تھی تو اُس کے ایک ایک انداز میں شوخی......بچھرے ہوئے رحیمو چا کا
عکس نظر آتا تھا......ایک مرد شیر کی چنگھاڑ سنائی دیتی تھی......مگر مس نیلی میں اُسے رحیمو
چاچا کی بے گور وکفن سڑتی ہوئی لاش نظر آتی تھی...... یہ شکایت سلمہ کے مس نیلی بن
جانے پر نہیں ہوئی تھی ...... یہ تو سلمہ کا اپنا معاملہ تھا۔اس سلمہ کا...... جو بچپن میں ہی
رحیمو چا کا دست شفقت چھڑا کر شاہراہوں کی بھیڑ میں گم ہوگئی تھی۔ظاہر ہے سلمہ
زندگی کے کیسے کیسے نشیب وفراز سے گزری ہوگی......کتنی ہی بار ٹوٹ ٹوٹ کر بکھری
ہوگی......کتنی ہی بار زندہ رہنے کی ہوس نے خود سے سمجھوتے پر مجبور کیا ہوگا۔اور پھر اگر
ان حالتوں میں سلمہ کسی بھی گھر میں پناہ لیتی ہے۔تو اُس میں اُس کا کوئی بھی قصور نہیں
ہے......قصور تو بس اُس مس نیلی کا ہے جو گھر کے اُس چھپر کھٹ سے بے نیاز ہے،
جہاں ناگہانی بارش کے جھونکے اُسے بھگو بھی سکتے ہیں......طوفان اور آندھی کے جھکڑ
اس کے گھر کی ایک ایک اینٹ کو ہلا سکتے ہیں...... ملبے میں دفن کر سکتے ہیں۔

شکایت بس اُسی مس نیلی سے ہے، جو سلمہ کا چولا اُتار کر شاہراہوں پر بالکل
ننگی کھڑی ہے......اور باس کے اندر کا وحشی جانور دیر سے اپنے ہونٹوں کا لعاب پوچھتا
ہوا اس کا جائزہ لے رہا ہے......وہ اچھی طرح جان رہا ہے......ایک وقت آئے گا جب
مس نیلی کی نیلی لاش چاٹتا ہوا باس ایک دم سے، اُس سے بے تعلق ہوجائے گا......

رحیمو چا کی میت جب اٹھی تھی تو کیا ہندو کیا مسلمان سب کندھا دینے کے
لئے بے چین نظر آرہے تھے۔آنکھوں میں ٹپ ٹپ آنسو بھرے تھے......اور ہر کوئی
جیسے چیخ چیخ کر یہی کہہ رہا تھا......آج ایک مسلمان نہیں مرا ہے۔آج ایک ہندو کی
موت نہیں ہوئی ہے......بلکہ ایک عہد کی ترجمانی کرتا ہوا ایک نیک انسان ہم میں سے

خاموش ہو گیا ہے۔

تو یہ وہ لوگ تھے...... جو اپنی اچھائیوں اور نیکیوں کی وجہ سے تاریخ بن جاتے ہیں...... کریم بیگ کا دل چاہتا کہ وہ مس نیلی سے پوچھے...... مس نیلی! کیا وجہ ہے تمہارے اندر ڈھونڈھنے سے بھی وہ انسان نظر نہیں آ رہا ہے۔ کیا وہ وقت کے تھپیڑوں میں کہیں کھو گیا ہے...... اگر ایسا ہے تو اُسے توبہ کرو مس نیلی...... کہ یہ انسانی فطرت بہت عجیب ہے...... جو ایک ہی موسم سے گھبرا جاتی ہے...... اور تبدیلیوں والے موسم کا تقاضہ کرتی ہے۔

اور کریم بیگ کو یاد آیا...... جب پہلی بار اُنہوں نے کمرے کی گرد ہٹائی تھی...... قرآن پاک کی دھول جھاڑی تھیں...... رحل کو صاف کیا تھا۔ تسبیحیں دوبارہ مضبوطی سے تھام لی تھی۔ اور اپنے اخلاق کی کمزوریوں پر فتح پا کر بشاش قدموں سے آفس گئے تھے...... تو رگھوبیر، رتھ اور مائیکل کی آنکھیں تعجب سے پھیلتی چلی گئیں...... رتھ نے اُس کا راستہ روک دیا تھا...... اور اس کی پیٹھ پر ایک زوردار دھپ لگا کر بے حیائی سے بولا تھا...... کیوں بے! تو بھٹک رہا ہے کیا......؟

تو اس کی پاک تبدیلی کا یہ مفہوم لیا تھا رتھ نے...... مگر جانے کہاں سے بلا کی خود اعتمادی اُس کے اندر آ گئی تھی...... آفس کے سالانہ جشن کی طرح وہ اپنے اخلاق کی کمزوریوں کا مجرم نہیں بنا بلکہ پلٹ کر جواب دیا...... نہیں دوست! میں بھٹکا ہوا تو کل تھا آج تو اپنے اندر کے بھٹکے ہوئے آدمی کو راستہ دکھا رہا ہوں......

پھر ذرا ٹھہر کر اُس نے دوستوں کی آنکھوں میں جھانکا اور سرگوشیاں کرتے ہوئے کہا......

''میرے عزیز! کیا تمہیں یقین ہے...... کہ بغیر اپنی منزل کا تعین کر کے تم سب جی سکو گے...... شاید نہیں...... کچھ تو زندگی کے اصول ہونے چاہئیں نا...... کچھ تو

قوانین ہونے چاہئیں...... جن سے زندگی کو ایک خوبصورت دشا دکھائی جا سکے...... میرے دوست...... ایک دن ایسا بھی آتا ہے...... جب قہقہوں سے دل اُچاٹ ہو جاتا ہے...... ہنسی ٹھٹھول سے آدمی اکتا جاتا ہے...... ان نیرنگیوں سے بھی گھبرا جاتا ہے...... تھک جاتا ہے...... جسم کے اعضاء بوڑھے ہونے لگتے ہیں...... ایک مسلسل تھکن زندگی کا زیور بن جاتی ہے...... تو میرے دوستو...... اب ہمارے ساتھ بھی یہی کچھ شروع ہونے والا ہے۔ اب وہ وقت قریب ہے کہ قہقہوں سے ہم تھک جائیں گے...... دل اُچٹ جائے گا...... تو تم ہی بتاؤ...... کب تک اس طرح اپنے پاؤں سے بے منزل بھاگتے پھرو گے...... ایک دن تو ٹھہرنا ہی ہوگا...... جب وقت تمہارے پاؤں کو ایک گھنگھرو دے کر اپنے دائرے میں موڑ دے گا...... اور تم گھبرا کر اس کے ساتھ ساتھ ہو لو گے...... کہ یہی قوانین ہوں گے...... بندھے ٹکے اصول ہوں گے جن سے زندگی واقعی بہت خوبصورت بن جاتی ہے۔

تو میرے دوست بتاؤ...... میں بھٹکا کہاں ہوں۔

میں تو تھک گیا ہوں...... اور اپنی تھکن مٹا رہا ہوں۔

کریم بیگ ہنسے...... اور ہنستے ہی چلے گئے...... جب ٹھہرے تو دوستوں کا وہ بے ہنگم قہقہہ ان کے کانوں سے ٹکرایا۔

''دماغ چل گیا ہے اس کا...... اب یہ ہم میں سے نہیں رہا۔''

کریم بیگ اچانک چپ ہو لئے۔ جیسے کسی زہریلے سانپ نے کاٹ کھایا ہو...... اور کچھ ہی دیر بعد یہ خبر سارے آفس میں گرم ہو چکی تھی...... کہ نئی تبدیلی کے انوکھے موسم نے کریم بیگ کو پاگل کر دیا ہے۔

اور اُس وقت بھی کریم بیگ اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے ٹیبل پر رکھے ہوئے ٹائپ رائٹر مشین پر ہلکے ہلکے اپنی انگلیوں سے ٹائپ کر رہے تھے...... دائیں طرف والی

کرسی پر سموئیل بیٹھا تھا۔اس کے بغل والی پر رتھ......سامنے والی کرسی پر مسز بھٹنا گر بیٹھی
تھی اور فریز رکا فکا کے مشہور ناول The Castle کا مطالعہ کر رہی تھی اور دروازے
کے قریب والے ٹیبل کے پاس مس نیلی کی بڑی بڑی آنکھیں ٹائپ رائٹر مشین پر جھکی
ہوئی تھیں......مگر کریم بیگ جانے کیوں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے سب کی آنکھیں بس
اسی کو دیکھ رہی ہوں......مگر وہ ان دیکھا کرتے ہوئے اپنے کام میں مشغول رہا......

کچھ دیر بعد آفس کا پیون آیا اور خبر دی......''صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔''

کریم بیگ نے سر اٹھایا......ٹائپ رائٹر مشین پر چلتے ہوئے ہاتھ ٹھہر گئے
...... تھکے تھکے وجود کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے ...... اور صاحب کے کمرے کی
طرف بڑھ گئے......

کال بیل پر انگلی رکھی......اور دو مسکراتی چمکیلی آنکھیں ان کے اندر اُترتی چلی
گئیں۔

کریم بیگ مدھم آواز سے بولا......گڈ مارننگ سر...... مجھے بلایا—

صاحب تھوڑا ہنسے...... پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولے—یہ میں کیا سن رہا
ہوں کریم بیگ— کیا یہ سب صحیح ہے۔

''جی ہاں......''اس نے بہت مختصر جواب دیا۔

''مگر آخر کیوں؟''

صاحب کی آنکھوں میں شکن آ گئی تھی۔

اور پھر کریم بیگ نے انہی باتوں کو دہرا دیا......جو اُس نے اپنے دوستوں کو
بتائی تھی......کہ زندگی کی طویل دوڑ نے کیسے اُسے تھکا دیا۔کیسے ان قہقہوں سے دل
اچاٹ ہو گیا اور زندگی کے بندھے ٹکے اصولوں سے دائمی محبت کا احساس ہوا۔

صاحب نے بڑی عجیب نظر اس پر ڈالی......آنکھوں میں تشویش کی ایک لہر

آئی......اور صاحب نے پراسرار سناٹے کا قتل کر دیا۔

''اچھا یہ بتاؤ کریم......اب تم آفس سے متعلق کسی بھی فنکشن میں حصہ لے
سکتے ہو؟''

وہ صاحب کی باتوں کی تہہ میں جا کر بولا......

''جی ہاں سر......مگر......ایک فاصلہ رکھ کر حصہ لوں گا......''

صاحب نے زوروں سے قہقہہ لگایا......''تو فاصلہ رکھ ہی دو گے......''

پھر دیر تک ہنستے رہنے کے بعد بولے......کریم!تم اب میرے پرانے دوست
نہیں رہے۔بس اسی کا غم ہے۔اور اسی لئے تمہیں بلایا تھا۔تم جہاں چلے گئے ہو......
وہاں سے ہم تمہیں واپس آنے کے لئے تو نہیں کہہ سکتے ہیں۔تاہم اتنا کہنا ہمارا فرض ہوتا
ہے......کہ کبھی اُن آنکھوں کو بند کر کے ہماری طرف بھی دیکھنے کی کوشش ضرور کرنا......

اسی دن سے کریم بیگ نے اپنے اور دوستوں کے درمیان فاصلے کی ایک
بلند دیوار اٹھا دی کہ وہ اس دیوار سے خوش تھا۔اب وہ ذہنی سکون محسوس کر رہا تھا......
انتشار کی چٹانیں ٹوٹ چکی تھیں۔رضیہ کے خاموش ہونٹوں پر وہی پرانی شوخی پھر سے
لوٹ آئی تھی...... بڑھاپے کے نقش و نگار اُس کے کھلے ذہن کی دھوپ میں آرام
کر رہے تھے۔مگر انجم اب بھی نئے لباس میں فرسٹریشن کے پرندے کے ساتھ انجانے
سفر میں گم تھا۔وہ نئے مزاج کے اس شہر میں زمانے کی کڑواہٹ پی کر بھٹک رہا تھا۔

انجم کی آنکھوں میں وہی چھٹپٹاہٹ تھی،جو آزادی سے قبل غلامی کے احساس
سے کبھی ابی حضور، رحیمو چا، اور امی حضور کی آنکھوں میں کوندتی پھرتی تھی......انجم کی
آنکھوں میں وہی جلا دینے والی چمک تھی......اڑتے اڑتے یہ خبر اُسے بھی معلوم ہوگئی تھی
کہ انجم نے اپنے ہاتھوں میں قلم سنبھال لیا ہے۔اب وہ ایک مورچہ لے رہا ہے......

یہ کیسی جنگ ہے—نہ اس نے پوچھا۔نہ انجم نے بتایا۔

اور انجم بھی کیونکر بتاتا۔اس کی آنکھیں سرخ انگاروں کی مانند جل اٹھیں تو
اس نے اپنی تخلیق میں روشن الفاظ کے بچھو بھر دیئے اور بچھو صفحۂ قرطاس پر پھیل گئے.......

''......میں دیکھ رہا ہوں کہ ہر طرف لوٹ ہے.......
میں فسادات کے ___ اس نئے مزاج کے شہر سے مخاطب ہوں.......
جہاں بربیری کے حقوق کے خوبصورت نعرے دے کر عہد قدیم کے پیامبر
کتابوں کی بھیڑ میں کھوتے چلے گئے۔

میں دیکھ رہا ہوں ......کہ آزادی پھر سے ایک مظلوم بکری کی طرح کسی
شاطر سیاستداں کے گھر کی کھونٹ سے باندھ دی گئی ہے۔

کچھ لوگ بڑی عجیب شکلوں میں آتے ہیں۔ وعدوں اور خوابوں کی پٹاری
کھول کر اس میں قید سانپ کو باہر نکال دیتے ہیں.......

میں دیکھ رہا ہوں ......مٹی کے بنے تمام گھروں کے قریب ایک ایسا ہی
زہریلا سانپ کھڑا ہے.......

شاطر سیاستداں تخت پر جلوہ افروز ہے......اور اس کے سامنے طرح طرح
کے کھانے چنے ہوئے ہیں......مگر اس کی بھوک غائب ہے.......
بہترین لباس پہنے پہنے اُس کے نوکر چاکر گھومتے پھر رہے ہیں۔
ٹیبل پر رکھا ہوا ٹھنڈا کھانا، وہ لوگ باہر کوڑے پر پھینک آتے ہیں ......
جہاں سڑک کے آوارہ کتے۔ان پر بے رحمی سے ٹوٹ پڑتے ہیں.......

اور میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں...... کہ ایسے ہزاروں گھر ہیں جہاں آنسوؤں کی
تمازت تو ہے......مگر چولہا سرد پڑا ہے.......

اور شاطر سیاستداں قہقہہ لگاتا ہوا اپنی پالتو بلی کو دیکھ رہا ہے جو سونے کی تھالی
میں پروسے ہوئے کھانے پر بازیگر کی طرح کھیل دکھا رہی ہے۔

اُف۔ بدبو بڑھتی جا رہی ہے...... بڑھتی جا رہی ہے.......
ہم سب کو پھر ایک جنگ لڑنی ہے......اس تیز بدبو کے خلاف''

یہ وہی تخلیق کے بچھو تھے۔جنہوں نے آگے بڑھ کر کریم بیگ کو بھی ڈنک مار
دیا......کریم بیگ سناٹے میں آ گئے ......انجم کے دل کے تہہ خانے میں جھانکنے کی ہلکی
سی کوشش کی تو رونگٹے کھڑے ہو گئے......انجم کبھی سوچ کے اس مقام پر بھی جا سکتا ہے
......وہ خیال تک نہ کر سکے تھے......وہ سر جھکائے صرف اتنا کہہ سکے.......

انجم!
میں تم سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوں.......
جب گھبرا جانا......تو مجھے آواز دے کر پکار لینا.......

(۵)

اُس دن صبح سے ہی تیز بارش ہو رہی تھی ......موسلا دھار بارش...... بادل
کے بڑے بڑے ٹکڑے آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔کریم بیگ کچھ ہی دیر قبل مسجد
سے لوٹے تھے......مسجد گھر سے بہت تھوڑے فاصلے پر تھی، فجر کی نماز کریم بیگ مسجد
میں ہی پڑھنا زیادہ پسند کرتے تھے...... چند مذہبی قسم کے لوگ مل جاتے......اور ایک
پاکیزہ ماحول بن جاتا......صبح میں جب وہ فجر کی نماز کے لئے مسجد گئے تھے تو بارش کی
ہلکی موسیقی شروع ہو چکی تھی۔ پھر مسجد پہنچتے پہنچتے بارش نے ویسٹرن میوزک کی طرح
چیخنا دہاڑنا شروع کر دیا......اور یہ ایک طرح سے اُن کے حق میں اچھا ہی ہوا کہ ہم
خیال لوگوں میں انہیں بیٹھنے، باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔

نماز ختم ہو گئی۔آسمان اب بھی سیاہی میں لپٹا ہوا تھا ...... یار دوستوں نے مل کر

خوش گپیوں کو ہوا دے دی...... باتیں چلیں......تو عقائد کا ہیبت ناک درندہ سامنے آ گیا۔
کریم بیگ نے جس کا تصور تک نہ کیا تھا۔

محلے کے سید صاحب نے اپنی داڑھی سہلاتے ہوئے کریم بیگ سے پوچھا۔'' بھائی کریم! تم سے ملتے ملاتے تو اتنی مدت ہو گئی......مگر آج تک تم سے تمہارے عقیدے کے متعلق نہ پوچھ سکا......آخر تم ہو کس عقیدے کے......کس مسلک کے ہو......''

کریم بیگ سٹپٹائے ......ابی حضور تو ہندوستان کو آزاد کرانے میں لگ گئے ۔ ہندوستان آزاد ہوا تو داعی اجل کو لبیک کہہ گئے ......اور وہ ذمہ داریوں کی چٹان پر چڑھ گئے ......اور اس درمیان مسلک عقائد وغیرہ چیزوں سے اُن کا واسطہ ہی نہ پڑا......

اس لئے نفی میں گردن ہلائی ......'' آہستہ سے بولے ۔بھئی سید صاحب ! بس مسلمان ہوں ۔عقائد نہیں جانتا ۔''

سید صاحب ہنسے......دیکھا دیکھی چند دوسرے بزرگ حضرات بھی قہقہہ مار کر ہنس پڑے ۔بھئی ...... یہ بھی خوب رہی......خوب رہی میاں کریم ! ایک نادان جاہل شخص بھی جانتا ہے کہ عقیدے کے بغیر گزارا نہیں ہے ......مختلف طرح کے عقیدے گفتگو کے لئے مختلف موضوعات پیدا کرتے ہیں ۔ اس طرح دماغ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بڑھتی ہے......میاں بغیر عقیدے اور مسلک کے آپ مسلمان کیسے ہو گئے......''

انہوں نے قہقہہ لگایا......اور ادھر کریم بیگ نے تشویش سے دریافت کیا۔

''بھائی سید صاحب! میرے نماز پڑھنے میں غلطی ہو گئی تھی کیا؟ ۔''

''نہیں بھائی'' سید صاحب نے منہ بنایا......اپنی نماز تم جانو......صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں ......مگر اتنا ضرور کہیں گے...... ہماری گفتگو میں حصہ لینے کے لئے کسی نہ کسی عقیدت کی حمایت تو ضروری ہے ــــ ورنہ مکمل مسلمان

نہیں کہے جاؤ گے۔''

کریم بیگ نے سر جھکا لیا......ان بزرگوں کی گفتگو کے بعد اب کہنے کے لئے باقی ہی کیا بچا تھا......مسجد کی دالان میں بیٹھ کر بارش کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے ۔ ذہن بھاری ہو گیا تھا ۔ وجہ صاف تھی......آج ان بزرگوں کی گفتگو سے انہیں خاصی چوٹ پہنچی تھی ۔ایسی چوٹ جس کے بارے میں کبھی وہ سوچ بھی نہیں پائے تھے ...... جائز اور ناجائز کے وہ فتوے جو انہوں نے سمجھائے ...... مذہب کا وہ ڈر اور خوف جو انہیں دکھایا......وہ سب اُن کے لئے بالکل نیا تھا۔جس کے لئے وہ تیار نہ تھے...... اور نہ کبھی اس بارے میں سوچا تھا...... وہ تو مذہب کو ایک سیدھا سادا راستہ سمجھ رہے تھے مگر مذہب اتنا الجھا ہوا بھی ہو سکتا ہے......اس پیچیدگی کا انہیں خیال تک نہیں آیا تھا ــــ

بارش تھوڑا تھمی تو وہ نڈھال قدموں سے گھر کی طرف بڑھ گئے ۔گھر لوٹے تو ذہن بری طرح سے تھک چکا تھا۔لیکن اب وہ ایک خاص نتیجے پر پہنچ چکے تھے......ذرا دیر پہلے کی وہ گرداب آہستہ آہستہ چھٹنے لگی تھی......اور کریم بیگ سوچ رہے تھے یہ لوگ ...... یہ سید صاحب جیسے لوگ......مذہب کی موٹی موٹی باتوں کی تہہ میں جا کر ایک نئے آدمی کو مذہب کے راستے سے کافی دور کر دیتے ہیں ۔اُس کے ذہن میں مذہب کا ایسا خوف طاری کر دیتے ہیں کہ وہ بھولے سے بھی مذہب کے قریب نہ بھٹکے......مگر اب بہر طور وہ ان کا منشا سمجھ چکے ہیں......اب وہ ان سے ہشیار رہیں گے۔

گھر پہنچ کر پہلا کام یہ کیا کہ برآمدے میں کرسی نکلوا دی......تا کہ بارش کے بعد والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا خاندان کے ساتھ مل کر لطف لے سکیں ......ایک پر رضیہ بیٹھ گئی ایک پر انجم ،ایک پر وہ بیٹھ گئے ۔ٹیبل پر رضیہ نے چائے کا کپ بھی رکھ دیا۔ چائے ڈھالی گئی......اور سب نے ایک ایک کپ اٹھا لیا...... چائے کی چسکیاں لیتے

ہوئے اب تک وہ انہی لوگوں کے متعلق سوچ رہے تھے۔گھوم پھر کر وہ اُسی موضوع پر آ کر رُک جاتے...... یہ لوگ مذہب کو بالکل ختم کر دیں گے۔

یہ لوگ بلا وجہ کا خوف طاری کر کے نئی نسل کو گمراہ کر دیں گے ...... تا کہ مذہب مٹ جائے، ختم ہو جائے......

کریم بیگ نے چائے کا کپ خالی کیا...... پھر رضیہ کی طرف دیکھا...... جو پوچھ رہی تھی......

''اس بارش میں آفس کہاں جاؤ گے......؟''

''بارش میں کوئی کام بند ہوتا ہے کیا......''

وہ مسکرائے......پھر بولے......آفس میں بہت سارا کام پڑا ہے رضیہ۔نہیں جانے سے سارا کام رہ جائے گا......''

رضیہ چپ ہوئی۔پھر آنکھوں میں چمک پیدا کرتی ہوئی بولی آج پھر کچھ فکر مند سے نظر آ رہے ہو...... بات کیا ہے۔

کریم بیگ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولے...... جب تک زندگی ہے رضیہ۔تب تک یہ فکر کے بادل چھٹنے والے نہیں ہیں......''

انجم نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا اور مسکراتے ہوئے پوچھا......اب فکر کیسی ابی! لوگ کہتے ہیں کہ ایک بار آدمی مذہبی بن جائے تو ساری فکر جاتی رہتی ہے۔''

''خوف تو بس اسی بات کا ہے بیٹے۔'' کریم بیگ تیز آواز میں بولے......

''میں نے ایک لمبی تھکن اوڑھ کر سوچا تھا ...... مذہب کے سائبان میں اپنی تھکن پیوست کر کے ہلکا ہو جاؤں گا......مگر لگتا ہے...... یہ راستہ بھی خاصہ مشکل ہے......قدم ابھی سے چھلنے لگے ہیں......''

انجم نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا— کریم بیگ نے ناشتہ کیا۔اور آفس روانہ ہو گئے۔

دوستوں سے علیک سلیک کرنے کے بعد وہ اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔

خلاف معمول آج انہوں نے خوش رہنے کی کافی کوشش کی تھی......اور کسی قدر اس میں کامیاب بھی ہوئے تھے...... ٹائپ رائٹر مشین پر ان کے ہاتھ برق رفتاری سے دوڑ رہے تھے—ذرا ٹھہر کر انہوں نے پورے روم کا جائزہ لیا......اور پھر ان کی مسکراہٹ ایک دم سے غائب ہونے لگی......دوبارہ وہی غصے کا تیور ان کے وجود پر حاوی ہونے لگا...... وہ جن قہقہوں......اور جن گندی باتوں کی بدبو سے بھاگتے پھرتے تھے......وہ بدبو تیزی سے کمرے میں پھیل رہی تھی/ اور کمرے میں ہوس کے کتنے ہی جگنو جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے......مس نیلی کی انگلیاں رجسٹر پلٹ رہی تھی......اور وحشیانہ نگاہیں اس کے جوان جسم پر باز کی طرح جھپٹا مار رہی تھیں......آس پاس سے قہقہوں کی نیم عریاں شعائیں نکل رہی تھیں۔

کل شہر میں پھر فساد ہو گیا۔جانتے ہو......ایک آواز ابھری۔

ہاں......جانتا ہوں۔ایک دوسری آواز

''فساد میں کیا ہوتا ہے''۔پہلی آواز

''گھر جلتا ہے'' دوسری گمبھیر آواز

''اور کیا ہوتا ہے......؟'' ایک ہلکے سے قہقہے کے بعد پوچھا جاتا ہے۔

''سامانوں کی لوٹ مار ہوتی ہے۔''

''اور کیا ہوتا ہے......؟'' قہقہہ تیزی اختیار کرتا ہے......

''اور کیا ہوتا ہے......؟'' ایک ہلکے سے قہقہے کے بعد پوچھا جاتا ہے۔

''اور......دوسری آواز سوچ میں ڈوب جاتی ہے......اور......! دوسری آواز میں بلا کی چمک پیدا ہوتی ہے......اور ''وہ'' ہوتا ہے۔

وہ کیا......؟ پہلی آواز کا قہقہہ تیز ہوتا ہے......

''پولیس سالی عیش کرتی ہے......'' دوسری آواز کا قہقہہ بھی تیز ہو جاتا ہے......

سب کچھ یہی ہے......ساری جنگیں بس اسی خاطر ہوتی ہیں...... پھر اسے فساد کا نام کیوں دیا جائے......اسے عیش کرنے کی بیماری کیوں نہ کہا جائے۔

دونوں قہقہے تیز ہو جاتے ہیں......اور پھر ان قہقہوں میں کئی دوسری آوازیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔

کریم بیگ کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں...... دماغ میں بھونچال آ گیا تھا...... مٹھیاں شدت سے کس گئی تھیں...... پورا جسم جھنجھنا گیا......

یہ لوگ پھر وہی حرکتیں کر رہے ہیں۔ تا کہ دوسرا ان کی آواز کی زد میں آ جائے......

یہ شیطان کی اولاد میں سے ہیں......اور ہر جگہ موقع دیکھ کر اپنی آواز تیز کر دیتے ہیں......تا کہ ایک گھناؤنے سماج کا قیام عمل میں آ سکے۔

کریم بیگ کے ذہن میں آندھی اٹھ رہی تھی...... یہ لوگ۔ بھولے بھالے معصوم لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں......شور، ہنگامے اور سیکس کی کھلی باتوں کو نجات کا واحد راستہ بتا کر انہیں گندگی کی کھائی میں گرانا چاہتے ہیں......

اور اس طرح کے کتنے ہی خیالات بیک وقت ان کے دماغ میں رینگ گئے ......اب وہ سوچ رہے تھے......خطرے کی گھنٹی جو انہیں سنائی دے رہی ہے......مس نیلی کو اس عجیب و غریب خطرے اور غیر متوقع حملے سے کیسے دور رکھ سکیں......اس کا احساس انہیں کیسے دلا سکیں——؟؟

دوپہر میں جب وہ آفس میں ایک جگہ کنارے بیٹھ کر لنچ لے رہے تھے...... رگھوبیر ٹہلتا ہوا ان کے پاس آ کر ٹھہر گیا......اور آہستہ سے بولا۔ میں تم سے کچھ کہنا

چاہتا ہوں کریم بیگ۔''

''بیٹھ جاؤ۔''

وہ فوراً ہی لنچ سے فارغ ہو گئے۔ پھر رگھوبیر کی آنکھوں میں جھانکا......''ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے۔''

''تم نے کچھ غور کیا'' رگھوبیر نے بے چین لہجے میں پوچھا——''مس نیلی میں اب وہ پہلے والی بات نہیں رہی......اب وہ کھل کر قہقہے بھی نہیں لگاتی۔''

''ہاں'' اس نے ٹھنڈی سانس لی......اس کی وجہ تو ظاہر ہے......مس نیلی کے قہقہے اب مس نیلی کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔''

مگر ایسا کیوں ہوا۔ ایسا کیوں ہوا کریم بیگ——رگھوبیر کی آنکھوں میں خوف تھا......تم بتا سکتے ہو......ایسا کیوں ہوا ہوگا۔ میں عجیب سا خوف محسوس کر رہا ہوں...... جانے کیوں ایسا لگ رہا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے......یا کبھی بھی وہ ''کچھ'' ہو سکتا ہے جس کی ہم نے توقع نہیں کی......یہ کچھ کیا ہے کریم بیگ! تم بتا سکتے ہو۔؟؟''

رگھوبیر کانپتے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''میں جو خوف محسوس کر رہا ہوں کریم بیگ——اسی خوف کا عکس میں مس نیلی کے چہرے پر بھی محسوس کر رہا ہوں......جیسے اُسے کسی بات کا خطرہ ہو......جیسے وہ ڈری ڈری ہو......آخر کیوں؟ وہ کون سی بات ہو سکتی ہے......؟

ٹھہرو میرے دوست''

کریم بیگ نے اس کی غیر حالت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس طرح خود کو اتنے سارے سوالوں میں قید نہ کرو...... افسوس کہ ان سوالوں کو تم نے شروع سے ہی محسوس نہ کیا......اور سوال کا زہر پھیلتا چلا گیا۔ اب چاہو گے کہ ان سوالوں کو اچانک سمیٹ لو......تو یہ ناممکن سی بات ہو گی۔''

مگر آخر معلوم بھی تو ہونا چاہئے کہ کیا ہونے والا ہے...... میں بہت خوف محسوس کر رہا ہوں''، رگھو بیر کا چہرہ پسینے میں ڈوب گیا تھا۔۔ مس نیلی ہماری دوست ہیں......مگر یہ خطرہ صرف ان کا نہیں ہے۔لگتا ہے جیسے اس نا گہانی آفت کی زد میں ہم سب آئیں گے''

''تم نے مس نیلی سے کچھ دریافت نہیں کیا''۔کریم بیگ نے بھی ایک عجیب طرح کا ڈر محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں پوچھا تھا۔مگر وہ بات ہی ٹال گئی۔مگر میں نے اس کی پیشانی پر لکھے ہوئے خوف کو پڑھ ہی لیا......وہ واقعی خوفزدہ ہے کریم بیگ......ہم سب کو اس کی مدد کرنا چاہئے۔

کریم بیگ نے ایک سرد سانس کھینچی۔

''اب کوئی فائدہ نہیں ۔میرے دوست رگھو بیر...... سچ تو یہ ہے کہ اب ہم مس نیلی کی کوئی مدد نہیں کر سکتے...... ہاں اب ہمیں ہوشیار ضرور ہونا چاہئے......تا کہ آنے والے خطرے کا اچھی طرح سامنا کر سکیں......''

رگھو بیر نے سر جھکا لیا اور افسردہ قدموں سے آہستہ آہستہ ڈگ بھرتا ہوا اپنے روم کی جانب بڑھ گیا۔

کریم بیگ بت بنا اپنی جگہ کھڑا رہا۔پھر بھاری قدموں سے آفس میں لوٹ آیا۔اُس کے اندر اندر ایک ان دیکھا سیلاب آیا ہوا تھا۔

آفس ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد جب وہ باہر آیا۔ٹھیک اُسی وقت سلمہ سر نیچا کئے بوجھل قدموں سے آفس کی سیڑھیاں طے کر رہی تھی۔وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب گیا۔اور نام لے کر پکارا......مس نیلی۔

مس نیلی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور اپنی جگہ ٹھہر گئی۔۔

''مس نیلی، مجھے یقین ہے۔رحیمو چا تمہارے اندر آج بھی۔دل کے کسی گوشے میں ضرور زندہ ہوں گے۔خود کو نہیں تو کم از کم اس سلمہ کو بچا لو۔جس کی رگوں میں ایک مرد مجاہد کا لہو دوڑ رہا ہے......''

اچانک مس نیلی کی آنکھیں بھر آئیں......اس نے کچھ کہنا چاہا......مگر کچھ کہہ نہ سکی۔۔

''مس نیلی!'' کریم بیگ نے دوبارہ کہا......تم درندے کا سامنا تو کر سکتی ہونا......''

''نہیں......''

مس نیلی کا سپاٹ سا جواب تھا۔آواز بھرا گئی تھی۔آنکھوں میں لہو کے ڈورے اُتر آئے تھے۔پھر خود پر قدرے قابو پاتی ہوئی بولی:

''میں پوری طرح اس کی زد میں آ گئی ہوں......''

اور اس سے قبل کہ صبر کا باندھ ٹوٹ جائے......وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

کریم بیگ دور تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔پھر یوں ہوا کہ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور ایسا محسوس ہوا......جیسے ایک تیز بدبو فضا میں پھیلتی جا رہی ہو......اور سب کے سب اس بدبو کی زد میں آ گئے ہوں۔

بابِ دوئم

بدبو

(۱)

بدبو بڑی تیزی سے بڑھی جا رہی تھی۔

شروع شروع میں تو اسے محض واہمہ تصور کیا گیا۔ بھلا آفس کی شاندار عمارت میں بدبو آخر کیسے داخل ہو سکتی تھی۔ مگر جب بدبو نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا تو لوگوں کا چونکنا واجب تھا۔

دس بجے سے آفس میں چہل پہل شروع ہو جاتی۔ آفس شہر کے سب سے پر رونق علاقے میں تھا۔ ہر وقت ٹریفک اور لوگوں کی چیخ و پکار کا دھواں آفس میں چھایا رہتا۔ بدبو کا احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔ دس بجتا اور جب سارے لوگ آفس میں اپنی اپنی جگہوں پر جم جاتے تو سیاست کے گوشت کو چھری سے کاٹنے اور اُدھیڑنے کا کام شروع ہو جاتا۔ پھر آفس۔ آفس کے باس، باس کی عشقیہ داستان سے شہر میں ہونے والے ہنگامے، روز روز ہونے والے نئے نئے فساد، وزراء کی کمزوری۔ اور کمزور سیاست پر گفتگو بڑی روانی سے شروع ہو جاتی۔ بیچ بیچ میں ٹھہر ٹھہر کر ٹائپ رائٹر مشین کی کھٹ کھٹ بھی گونجتی۔ جو یہ یقین دلا رہی ہوتی کہ یہ آفس ہے۔ اور آفس میں کام ہو رہا ہے۔

آفس کی دنیا واقعی ایک الگ تھلگ دنیا ہوتی ہے۔ کوئی کسی کا عزیز نہیں ہوتا مگر عزیز سے بڑھ چڑھ کر ہوتا ہے۔ خاص کر ایک چیمبر میں بیٹھنے والے لوگ ایک دوسرے کے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ بڑی بڑی فائلوں کے درمیان ہنسی قہقہوں کا شور دوستی کے رشتے کو ظاہر کرتا ہے۔ تو یہ آفس کا معمول تھا کہ ٹائپ رائٹر مشین پر چلتے چلتے ہاتھ جب ٹھہر جاتے تو آفس میں گفتگو کو ہوا دی جاتی......کوئی ناول ہاتھ میں لے

کر مطالعے میں مصروف ہو جاتا۔ کوئی اپنے بال بچوں کی بیماری کی فرسودہ کتاب کھول کر بیٹھ جاتا ــــــ اور آفس سب کے دکھ سکھ کو اپنی چھوٹی سی مختصر دنیا میں جذب کر لیتا۔

اس دن صبح کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے۔ مسز بھٹناگر، رگھو بیر ورما، اور آفس کے تقریباً سارے اسٹاف اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اور فائلوں کے انبوہ میں سر دیئے بار بار باہر کی جانب دیکھ رہے تھے۔ مس نیلی کی سیٹ اب تک خالی تھی اور یہ بار بار باہر کی طرف دیکھنا یہ ظاہر کر رہا تھا کہ مس نیلی کی غیر موجودگی پر سب کو حد درجہ حیرت ہے۔ ورنہ اب تک وہ باس کے روم میں بھی کئی بار چکر لگا آئی ہوتی۔ رگھو بیر اپنی بند آنکھوں میں خوف لئے شاید کسی ناگہانی خطرے کا منتظر تھا...... اور مشین کی کھٹ کھٹ فضا میں گونج رہی تھی۔

اچانک سب ٹھہر گئے۔

مس نیلی نے کمرے میں قدم رکھا۔ چہرہ بجھا بجھا تھا۔ آنکھیں جیسے اندر دھنس گئی تھیں...... جسم سے جیسے سارا خون نچوڑ لیا گیا تھا...... مس نیلی آگے بڑھی اور پریشان سی اپنی کرسی پر بیٹھ گئی...... ٹیبل پر پڑی ہوئی لاتعداد فائلوں میں اپنا سر دے دیا...... بال بھی الجھے ہوئے تھے جیسے کسی درندے سے بچ کر بھاگی ہو...... پھر یوں ہوا کہ سب کی آنکھیں تعجب سے پھیلتی چلی گئیں......

مس نیلی میز پر سر رکھے رو رہی تھی......

سب کی آنکھیں خوف سے پھیلتی چلی گئیں ــــ اور ڈھیر سارے سوال چھٹپٹا اٹھے آہستہ۔ آہستہ کئی لوگ اپنی کرسیوں سے اٹھے...... اور مس نیلی کو گھیر کر کھڑے ہو گئے......

''مس نیلی بات کیا ہے...... کیا بات ہے......''

مس نیلی نے سر اٹھایا۔ اتنے سارے لوگوں کو دیکھا...... پھر شدت جذبات سے آنسوؤں کے آبشار بہہ گئے اور لفظ گونگے ہو گئے۔

''نو...... نو مس نیلی...... تمہاری آنکھوں میں آنسو جچتے نہیں۔ آخر بات کیا ہے......؟'' رگھو بیر کی آواز کانپ رہی تھی۔

''بات؟''

مس نیلی نے رُک رُک کر جیسے یہ لفظ ادا کیا...... پرس کھول کر رومال نکالا...... آنسوؤں کے کتنے ہی قطرے رخسار پر آ کر خشک ہو گئے تھے...... آنکھیں پھول گئی تھیں...... پھر خود کو بحال کرنے کی سعی کی...... اپنے سیلابی جذبے کو روکا...... آنکھوں کو خشک کیا...... جیسے تسلی کے بیج اندر بوئے ہوں...... کہ یہ اپنے لوگ ہیں...... یہ سب اپنے لوگ دلاسے کے میٹھے پھل دیں گے اُسے...... اُس کی تسلی کا سامان کریں گے مگر تسلی بھی کیسی......

لفظ پھر اُس کا ساتھ چھوڑنے لگے...... وہی سیلابی جذبہ اُس پر حاوی ہو گیا۔ خود کو روک پانے کی کوشش میں بس اتنا کہہ سکی...... وہ...... درندہ میری جان لے لے گا...... میں بری طرح سے گھر گئی ہوں۔

پھر باندھ جیسے ٹوٹ گیا...... اور سسکیاں کمرے میں گونج گئیں......

ایک آنکھ نے دوسری آنکھ کو پھر نا سمجھی کی حالت میں دیکھا۔ اور بے چارگی کے اشارے آنکھوں میں رینگ گئے......

رگھو بیر نے مسز بھٹناگر کی آنکھوں میں جھانکا۔ اور ہذیانی پھٹی آواز میں بولا......

''مسز بھٹناگر تم سنبھالو...... آخر تم بھی تو ایک عورت ہو...... ایک عورت کا پرابلم تم اچھی طرح سمجھ سکتی ہو......

مسز بھٹناگر نے سمجھداری کے انداز میں سر ہلایا...... مس نیلی کے قریب گئیں

......اور اپنے خالص بھوجپوری لہجے میں ساتھیوں سے کہا...... بھیا...... جرا سانس تو لینے دو...... دیکھت نئی کھے...... بچر یا کیسن گرامو امیں مرل جائے ہے۔ پنکھو بند ہے...... ہٹو...... ہٹو...... مسز بھٹنا گر کا بھوجپوری لہجہ سن کر بہت سے لوگ اچانک مسکرا اٹھے۔ پھر بھیڑ ذرا چھٹی۔ دوسرے چیمبر کے لوگ بھی مس نیلی کا رونا سن کر جمع ہو گئے تھے۔

صرف باس نہیں آیا تھا۔ اور باس کے نہیں آنے پر کسی کو بھی حیرت نہیں تھی — باس کی بے رحم اور خود غرض طبعیت سے سب لوگ واقف تھے...... وہ صرف اپنی مرضی کا غلام تھا۔ آفس کے اسٹاف کے دکھ سکھ میں کبھی شریک نہیں رہا۔ کسی کے مرنے اور جینے کی اُس نے کبھی پرواہ بھی نہیں کی۔

مس نیلی کے پاس مسز بھٹنا گر کو چھوڑ کر وہ لوگ نکل آئے، اور پھر ایک دوسرے کو گھیر کر کھڑے ہو گئے......

آنکھیں اب بھی خوف سے لرز رہی تھیں۔

''یہ کس درندے کی بات کر رہی تھی، مس نیلی؟''

''شہر میں ایسے درندوں کی کمی نہیں۔''

''مگر یہ درندہ ہمارے آس پاس کا لگتا ہے......''

''کہیں باس تو......'' رگھو بیر نے ڈرتے ڈرتے کہا

''شٹ اپ'' ورما نے ڈانٹ دیا...... بغیر سمجھے بوجھے مت بولا کرو رگھو بیر۔ جانتے ہو اگر اس طرح کی غلط بات منہ سے نکل گئی تو کیا ہوگا۔ سسپنڈ کر دیئے جاؤ گے...... باس اپنے متعلق ایک بھی غلط بات سننا پسند نہیں کرتا......

رگھو بیر سہم گیا۔

''پھر آخر کیا بات ہو سکتی ہے؟'' مائیکل نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں بھی تو کچھ سوچنا چاہئے۔ اگر درندہ آج مس نیلی پر حملہ کر سکتا ہے تو کل مسز

بھٹنا گر کو بھی خطرہ پیدا ہو سکتا ہے...... پھر ہماری جان کی بھی خیر نہیں رہ جائے گی۔

سب عجب طرح کے خوف سے لرز گئے۔ اور ایک آواز میں بولے......

''چلو مس نیلی سے دریافت کرتے ہیں۔''

جس وقت وہ لوگ مس نیلی کے قریب پہنچے اُس وقت مس نیلی بالکل گم سم پتھر کی مورت کی طرح کرسی پر ڈھیر تھی۔ آنکھوں کے سارے خواب جیسے بجھ گئے تھے......

''یہ تو کچھ بتاتی ہی نہیں۔''

مسز بھٹنا گر نے ہار مانتے ہوئے تشویش کے عالم میں کہا......

''پھر کوشش کر کے دیکھو تو سہی۔''

''کافی کوشش کی۔'' مسز بھٹنا گر نے منہ بنایا۔ ''مگر سب لا حاصل۔ درندہ کی آواز منہ سے نکال کر بالکل مردہ ہو جاتی ہے...... جیسے یہ لفظ اُس کے حواس پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑتا ہے۔ کوئی صورت نہیں۔''

مسز بھٹنا گر نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ پھر کہا......

''ایک صورت ہو سکتی ہے۔ تم لوگ باس کو خبر کرو...... شاید......؟''

اور خوف کے عالم میں وہ لوگ کمرے سے باہر نکل گئے......

باس کے کمرے کے قریب آ کر ان پانچ چھ لوگوں کی ٹولی ایک دم سے ٹھہر گئی۔ آنکھوں میں ڈر سرایت کر گیا...... آنے کو تو آ گئے۔ اب پہل کون کرے گا؟ اندر پہلے کون جائے گا......؟؟

رگھو بیر ہمت کر کے بولا...... ''ڈر کیسا۔ اسی ڈر نے تو ہماری یہ حالت کر دی ہے۔ آخر ڈر کیسا۔ باس ہم سے کتنی محبت سے ملتا ہے۔ بھول گئے۔''

''مگر صرف فنکشن اور تقریب میں'' سموئل نے خوف سے کہا۔

عادل آہستہ سے بڑبڑایا...... آخر باس آدمی ہی تو ہے۔ پھاڑ تو نہیں کھائے گا۔''

رگھو بیر نے دوبارہ کہا......آؤ سب چلیں گے......آخر مس نیلی ہم سب کی دوست ہیں...... ہماری روم میٹ ہیں......ان کی عصمت کی حفاظت کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔''

ایک نے پھر خوف کے عالم میں کہا......پہلے دیکھنا چاہئے......باس کیا کر رہا ہے۔باس کا موڈ کیسا ہے......؟''

،،موڈ!'' ورما نے برا سا منہ بنایا......لوادھر ہماری ساتھی مس نیلی کی جان نکلی جارہی ہے......اور تم کہتے ہو کہ دیکھنا چاہئے باس کا موڈ کیسا ہے......ارے کیا کر لے گا وہ......''

پہلا سٹپٹا کر خاموش ہو گیا۔

ورما نے بھی سوچا......شاید وہ جذبات میں کچھ زیادہ ہی کہہ گیا ہے......اور پھر اس چیلنج کا سامنا کرنے میں نوکری سے واقعی ہاتھ دھو بیٹھا تو......؟

دفعتاً اُس نے اپنی سانسوں میں گھٹن سی محسوس کی۔اس کا لہجہ کمزور پڑ گیا۔ پھر آگے بڑھ کر دروازے کے خول سے اُس نے اپنی آنکھیں کمرے کے اندر پیوست کر دیں......

باس اپنے روم میں مزے کر رہا تھا...... ریوالونگ چیئر پر خود کو جھلاتا ہوا سوچ میں گم تھا—— پھر دائیں طرف والی سفید چمکتی ہوئی دیوار پر آویزاں رنگین کلینڈر پر اپنی نگاہیں مرکوز کر دیتا......جس کے گول گول دائرے میں آج کے دن کو سرخ نشان سے گھیر دیا گیا تھا۔دفعتاً اس کی مٹھیاں کھل گئیں۔اب وہ سے مسکرا رہا تھا۔

''دیکھا باس خوش ہے۔یعنی ہم مل سکتے ہیں''

ورما کے چہرے پر فتح کے آثار نمایاں ہو گئے۔سب نے اطمینان کی سانس لی۔آہستہ سے دروازے کو ناک کیا......

''یس کم ان''

باس کی آواز گونجی۔ایک لمحہ کے اندر سب کمرے کے اندر تھے۔

''کیا بات ہے۔''

باس ریوالونگ چیئر پر گھوم رہا تھا......اس کی نظروں میں حیرانی تیر رہی تھی۔

''کیا بات ہے۔تم لوگ اتنے ڈرے ہوئے کیوں ہو......؟''

رگھو بیر نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔سر ہم وہ مس نیلی کے بارے میں کہنے آئے تھے۔

باس کی مٹھیاں پھر شدت سے بند ہو گئیں۔''کیا ہوا مس نیلی کو......!

رگھو بیر ڈرتے ڈرتے بولا...... وہ مسلسل اپنے کمرے میں روئے جا رہی ہے......اُس کے کپڑے بھی کئی جگہوں سے پھٹے ہیں۔چہرے سے وحشت برس رہی ہے......اور جب مسز بھٹنا گر نے کچھ دریافت کرنا چاہا تو......تو بالکل پتھر بن گئی۔

''تو اس معاملے میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

باس نے سختی اور بے تعلقی سے کہا......پھر آگے بڑھ کر شیشے کے چمکدار ٹیبل سے قزحی رنگ بکھیرتا ہوا پیپر ویٹ اٹھا لیا اور پیپر ویٹ اس کے ہاتھوں کے کھیل میں چند لمحوں تک گم رہا۔پھر ایک سنجیدہ مسکراہٹ اوڑھتے ہوئے بولا۔

''تم ہی بتاؤ۔مس نیلی کے معاملے میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔یہ تمہارا پرابلم ہے......تم ہی سلجھاؤ۔''

اور اتنا کہہ کر باس کسی معصوم بچے کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

سب کی غیر ہو رہی تھی۔نظریں جھکی تھیں۔کہتے تو کیا کہتے کہ باس! یہ پرابلم ہم سے زیادہ آپ کا ہے کیونکہ آپ نے ہی اُس کی جوانی پر رحم کھا کر اُسے نوکری دی تھی کہ آپ نے ہی اُسے رہنے کو فلیٹ دیا تھا۔ہم سے زیادہ مس نیلی سے آپ کی دوستی

تھی۔ہم سے زیادہ اُس درندے کو آپ جانتے ہیں۔

مگر سب خاموش رہے......اور فرمانبردار غلام کی طرح جیسے آئے تھے ویسے ہی رخصت بھی ہو گئے۔

باہر آکر سب نے پھر بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

''کیا حل نکلا؟''

رگھوبیر نے ورما کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر پوچھا۔

اور ورما اس کے لہجے میں طنزیہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولا۔

''درندہ لوگ سے مس نیلی کو اپنی حفاظت کے بارے میں سوچنا چاہیئے تھا۔''

جب یہ لوگ دوبارہ اپنے چیمبر میں واپس آئے تو مس نیلی ویسی ہی بے جان اور مردہ حالت میں اپنی جگہ اب بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ جبکہ مسز بھٹناگر کو قرار نہیں تھا۔وہ آس پاس تمام ٹیبلوں، کھڑکیوں، دروازوں کے پاس جا کر کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہی تھی۔چہرے پر شکن ہی شکن تھی۔اور آنکھوں کے گرد پڑے حلقے گہرے ہو گئے تھے۔

جب یہ لوگ قریب آئے تو مسز بھٹناگر آہٹ پا کر چونکیں۔پھر ان کی جانب دیکھتی ہوئی بولیں......تم لوگوں نے کچھ محسوس کیا۔

''نہیں تو۔کیا چیز؟''

''بدبو''

مسز بھٹناگر منہ سکوڑ کر بولیں۔اور سب کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں جیسے کوئی جنگلی جانور مر گیا ہو...... یا سڑے ہوئے گوشت کو جلایا جا رہا ہو...... ایک تیز بدبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔مگر یہ بدبو کہاں سے پیدا ہو رہی تھی۔مسز بھٹناگر ہر جگہ گھوم آنے کے بعد تھکی ہاری اپنی کرسی پر گر گئیں۔

لو۔ایک اور نئی بات۔ایک اور نیا پرابلم، کمبخت نہ جانے کہاں سے اٹھ رہی ہے۔کچھ معلوم ہی نہیں۔چپہ چپہ تلاش کر لیا۔

مس نیلی نے سر اٹھایا۔آنسو خشک ہو گئے۔

اب رگھوبیر وغیرہ سب لوگ مل کر بدبو کا سبب دریافت کرتے چل رہے تھے۔

مسز بھٹناگر تیز آواز میں بولیں......کوئی فائدہ نہیں۔اگر جگہ معلوم ہو تو آدمی بدبو دور بھی کر دے...... جب جگہ کا تعین ہی نہ ہو تو مشکل ہے۔بدبو تو بڑھتی ہی جائے گی۔''

تو اب کیا ہوگا۔؟''

خوف کا رنگ سب کی نگاہوں میں سمٹ آیا تھا

کریم بیگ کے لئے اب اُس جگہ ایک پل بیٹھنا بھی محال ہوا جا رہا تھا۔وہ کئی گھنٹوں سے گھبراہٹ کا یہ عجیب و غریب کھیل دیکھ رہا تھا۔مگر دیکھتے ہوئے بھی خاموش تھا۔آخر کیا کہتا کہ یہ بدبو تو تمہاری اُپج ہے عزیزو......افسوس صد افسوس کہ تم نے پہلے دریافت نہیں کیا......اور بدبو اس حد تک بڑھ گئی......

اُس نے تھکی ہوئی سانسیں چھوڑیں اور بوجھل قدموں سے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔اور اپنے لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔سرانڈ سب کے نتھنوں میں سمائی ہوئی تھی۔اور سب اپنی ناک دبائے بدبو سے نجات پانے کی کوشش کر رہے تھے۔

سب سے پہلے مس نیلی اپنی جگہ سے اٹھی اور بغیر کچھ کہے آفس کی سیڑھیوں سے نیچے اتر گئیں۔

کریم بیگ پھر آہستہ سے بڑبڑایا۔یہ بدبو خود تمہاری سانسوں میں تھی۔افسوس۔افسوس تم نے کبھی محسوس نہیں کیا۔

آسمان خاموش تھا۔ابابیلیں چہچہاتی ہوئی اڑتی جا رہی تھیں۔ایک حشر برپا تھا کہ سب لہولہان چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے۔

''کیا یہ بدبو ختم نہیں ہوسکتی''

رگھوبیر نے سہم کر کریم بیگ سے پوچھا۔

اور کریم بیگ ڈرامائی انداز میں بولا۔ جب بھی کسی قوم کا زوال آتا ہے ......خدا اپنا عذاب بھیجا کرتا ہے...... یہ بدبو اس کے ذریعے بھیجے گئے عذاب کی ہی شکل ہے۔''

رگھوبیر کا چہرہ فق ہوگیا۔

بدبو بڑھتی جارہی تھی۔سب دھڑ دھڑاتے ہوئے آفس کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

صرف اکیلا کریم بیگ بچ گیا تھا۔وہ اچھی طرح جان رہا تھا آج مس نیلی کی وجہ سے لوگوں نے یہ بدبو بھانپ لی اور بدحواس ہوگئے۔کل سے پھر یہ لوگ معمول پر لوٹ آئیں گے اور بدبو کو فراموش کر کے زمانہ کا مزہ لوٹنے میں لگ جائیں گے۔اللہ اپنے عذاب سے محفوظ رکھے۔''

سیڑھیاں طے کرتے ہوئے کریم بیگ بے خیالی میں کسی سے ٹکرا گیا۔ یہ اُس کے گھر کا نیا نوکر تھا۔ جو اُس کے بجھے ہوئے چہرے اور پریشان حال طبیعت پر نظریں پھیرتا ہوا کہہ رہا تھا۔

''صاحب! بیگم صاحبہ نے بلایا ہے اسی وقت''

پھر پھسپھسا کر بولا...... سننے میں آیا ہے......شہر میں کہیں دنگا ہوگیا۔بیگم صاحبہ کافی پریشان ہیں۔''

کریم بیگ نے غضب ناک نظروں سے دیکھا، پھر تیز قدموں سے سیڑھیاں پھلانگنے لگے۔

(۲)

شاہراہِ عام پر وہی دوڑ بھاگ تھی کہ سب ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں مصروف تھے۔گاڑیوں کا ہارن مستقبل چیخ چیخ کر کان کے پردے پھاڑ رہا تھا۔شور وغل کی فضا نے شہر سے امن چھین لیا تھا۔اپنی اپنی سمتوں کا تعین کرتی ہوئی گاڑیاں برق رفتاری سے بھاگی جارہی تھیں۔

شاہراہ عام کے کنارے کنارے ایسے مختلف مکانات بنے ہوئے تھے جہاں کے لوگوں نے شاہراہوں سے اٹھتی ہوئی بدبو کو محسوس تو کر لیا تھا مگر کسی وجہ سے چپ تھے۔......کہ کہیں ان کے اندر کے سکون میں خلل نہ پڑ جائے......وہ اپنے سکون میں مداخلت نہ کل برداشت کرتے تھے اور نہ اس کا احساس آج اپنے دل میں لانا چاہتے تھے بلکہ ان باتوں سے فرار حاصل کر کے جینے کو ہی زندگی سمجھتے تھے۔

اور بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اتنی بڑی......نہ ختم ہونے والی شاہراہ پر پیدل چلتے جاتے تھے......آنکھیں کہیں بھی بوجھل نہیں ہوتی تھیں۔ بلکہ پر رونق شاہراہوں......گاڑیوں کی قطار......خوبصورت، عالیشان دکانوں کے بڑے سائن بورڈ، شیشے کے چمکتے دروازے......اور خرید فروخت کرنے والے لوگوں کی نگاہیں ماحول میں پھیلی ہوئی بدبو کو محسوس کرنے کے بعد بھی خاموش تھیں—اور کبھی کبھی یہ آنکھیں شاہراہ کی دوسری جانب چلی جاتیں جہاں فٹ پاتھی دکاندار، پسینے میں تر بتر گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کررہے ہوتے...... بڑے سلیقے سے ان کی ٹوکریاں سجی ہوتیں—

کریم بیگ پیدل ہی گھر چلے جارہے تھے۔کبھی کبھی جب اندر طوفان اٹھ رہا۔ہوتو پیدل چلنے میں بھی مزہ آتا ہے۔گھبراہٹ اور کمرے میں تیز بدبو کا پھیلنا......

آزادی ملے تو ایک مدت ہوگئی۔مگر سکون کا ایک دن بھی نصیب نہیں ہوا......آج بھی
رات کے اندھیرے میں رضیہ کی سرگوشیاں کبھی کبھی طوفان اٹھا دیتی ہیں کہ بتاؤ......
آزادی سے کیا ملا تمہیں......؟ کتابوں میں الجھا ہوا انجم دن بھر کی تھکن کا دھواں نکالتا
ہوا جب وقت شام گھر لوٹتا ہے......تو ہونٹوں کی تشنگی اور مرجھائی آنکھیں سوال بن
جاتی ہیں—— پلکیں بھیگ جاتی ہیں......اور گزرے ہوئے وقت کی یادیں ایک ایک کر
کے ریٹینا کے پردے پر پھیل جاتی ہے۔

جب وہ صرف کریم بیگ نہیں تھا بلکہ چودھری کریم بیگ تھا۔ایک معزز
خاندان کا فرد۔فرنگی حکومت کا خطاب یافتہ خاندان......اس نیم خواب آزادی نے
صرف اس کے محل نہیں چھینے......شان وشوکت نہیں لی۔خطاب بھی گم کر دیئے اور
اُسے آفس کی رنگینیوں کے سپرد کر دیا۔

وہ چودھری ولا جو کبھی محل تھا......وقت کے زہریلے ناخنوں نے جنگل جھاڑ
کر دیا۔جو پائیں باغ تھا کہ بغل سے شفاف ندی گنگناتی ہوئی مست چال سے گزرا
کرتی تھی......اپنی عظمت کا اعتراف کرایا کرتی تھی۔جہاں اس کے آبا و اجداد اپنی
شامیں گزارا کرتے تھے......وہ نظارے گم ہوگئے—— کہانیاں کھو گئیں—— صرف تین
چار کمروں کا فلیٹ رہ گیا۔باقی سب بک گیا جس نے چاہا لوٹ لیا۔جس نے چاہا بے
بسی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔چمکتی شفاف دیواروں پر اندھیرے کے جھینگر چھا گئے۔
دودھیا سپیدی گرد وغبار میں ڈوب گئی۔خوفناک طوفان آیا اور سب کچھ اڑا کر لے گیا۔
جاگیریں چھن گئیں......شان چلی گئی۔محل کے خوبصورت چاندنی جیسے جسم پر بربادی
کی داستان تحریر کر دی گئی......مہا دیوا روڈ کی ایک بوسیدہ کوٹھی رہ گئی۔جس کی چمک کو
وقت کا آفتاب نگل گیا۔رئیسی چلی گئی......آرہ کے معزز چودھری خاندان کے جاہ و
جلال کا آفتاب دھیرے دھیرے ماند پڑتا گیا۔آنگن میں پڑی ہوئی کسی بوڑھے

بزرگ کی لاش پر جیسے مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں......

کریم بیگ نے ایک ٹھنڈی سانس لی......صدیوں نے ہر دور میں ایک نہ ختم
ہونے والا خلا پیدا کیا ہے—— کھنڈرات ماضی کی یاد دلاتے ہیں......کیا وہ آج بھی اس
شہر آشوب میں اپنے آبا کے کارناموں کو فراموش کر سکے گا؟ وہ......کہ جن کے نام سے
سر جھک جایا کرتے تھے۔جن کی شہرت کا ساتویں آسمان پر بھی چرچا تھا۔ فلک بوس
دیواریں۔خس وخاشاک میں لپٹ کر اپنی عظمت کھو چکی ہیں......باہر دالان میں اب
بھی کتے ہی شیر، چیتے ہرن کی کھالیں موجود ہیں۔جن میں اب کیڑے لگ چکے......مگر
ایک تاریخ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔کس کو مورد الزام ٹھہرایا جائے......سب کچھ تو
لٹ گیا۔ہرے بھرے درخت کی شاخوں کو دیمک کھا گیا......تاج اتر گیا۔شہنشاہیت
چھین لی گئی......محل میں بجتی ہوئی شہنائیوں کی آواز خاموش ہوگئی۔اور دالان میں بچ
گیا......ایک افسردہ دم توڑتا گیت کہ ایک وقت ایسا بھی تھا......!

گزرے ہوئے زریں وقت کا ماتم کرتے ہوئے سو گئے دادا مرحوم......کہ
ہائے کیا زمانہ تھا......اب صرف یادیں ہیں......نہ صبح چین ہے نہ شام......کہ جس نے
راجے مہاراجوں میں اپنی زندگی گزاری ہو۔وہ اس دور غلامی میں کیونکر جی سکے گا۔
سو گئے دادا مرحوم......عالیشان عمارت کا ایک اور کنگرہ گر گیا......

پھر والد مرحوم کا دور آیا جب آزادی کی شمع ہر گھر میں روشن تھی۔اور کریم بیگ
نے وہ زمانہ بھی دیکھا جب وطن پر جاں نثار کرنے والوں نے غلامی اور نفرت کی
زنجیریں توڑ ڈالیں۔فرنگیوں پر حملہ بول دیا۔تاریخ نے خون کی کہانیاں لکھیں......اور
پیشانی پر ایک نام جگمگ کر اٹھا......آزادی......آزادی

اور آزادی کے اتنے سالوں بعد اس سوال نے کریم بیگ کو بار ہا ڈسا ہے
......آخر کیا ملا اُنہیں......رضیہ کے آنسو؟ انجم کی دشت نوردی......آفس میں جھکا ہوا

ان کا سر...... برابری کے خوبصورت نعرے کہاں پرواز کر گئے۔

شاہراہوں سے دوڑتی بھاگتی گاڑیوں سے بے نیاز وہ چپ چپ قدم بڑھائے گھر کے فاصلے کو کم کر رہے تھے۔گزرے ہوئے کو مت سوچو کریم بیگ !وہ صرف کہانیاں ہیں— بھول جاؤ—ایسی باتیں تاریخ ضرور ہوا کرتی ہیں مگر ایسی تاریخ پر آج لوگ ہنسا کریں گے۔تمہارا مذاق بنائیں گے۔

اس لئے بھول جاؤ کریم بیگ......بھول جاؤ ......

کریم بیگ نے سر کو ایک جھٹکا دیا......اور دھڑا دھڑاتے ہوئے گھر میں داخل ہو گئے......اور دفعتاً چونک کر اپنی جگہ ٹھہر گئے۔

رضیہ نے آہٹ پا کر سر اٹھایا مگر اچانک اُس کے چہرے پر بھی پریشانی دوڑ گئی۔

انجم باہر برآمدے میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔اچانک وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور ان حیران پریشان لوگوں میں شامل ہو گیا۔

''کچھ ہے''

رضیہ آہستہ سے بولی۔تم نے کچھ محسوس کیا انجم۔

''ہاں......جیسے کوئی گندی چیز مہک رہی ہو......''

''وہ گندی چیز کیا ہو سکتی ہے۔''

رضیہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

کریم بیگ نے سر پکڑ لیا......''تو بدبو یہاں بھی چلی آئی......اب کارخانۂ حیات کا خدا حافظ ہے۔''

پھر یوں ہوا کہ انجم اور رضیہ دوڑ دوڑ کر بدبو تلاش کرنے میں لگ گئے ......

پلنگ، چارپائی، کونے، نالیوں وغیرہ میں جھانکا جانے لگا۔مگر کچھ ہو تب تو پتہ لگے۔

رضیہ بڑبڑا رہی تھی......

'صبح میں بھی پورے گھر کی صفائی کی ہے۔کونا کونا صاف کیا ہے......کوئی سڑی گلی چیز نہیں پھیکی گئی۔گھر میں جانور بھی نہیں ہیں کہ وہ ادھر ادھر سے گندی چیز لا کر ڈال دیں......پھر یہ بدبو آخر کہاں سے چلی آئی......؟'

کریم بیگ کرسی پر بیٹھ گئے—

رضیہ ادھر اُدھر دیکھتی ہوئی اچانک ٹھہر گئی اور کچھ سوچ کر عجیب نگاہوں سے کریم بیگ کی طرف دیکھنے لگی......

''سنو: کہیں تم آفس سے تو......؟''

''کیا بکواس کرتی ہو'

کریم بیگ چیخا............مگر پھر نرم پڑ گیا۔کہیں واقعی بدبو آفس سے تو اس کے ساتھ نہیں آ گئی...... جہاں مس نیلی کا ٹھنڈا جسم کرسی پر اکڑا ہوا تھا۔اور ٹھیک اُس کے جاتے ہی کمرے میں بدبو پھیل گئی تھی۔کہیں بدبو اس کے جسم سے تو نہیں لپٹ گئی؟

اُس نے خوف سے جھرجھری لی......پھر سوچا......رضیہ کے شک کا ازالہ ضرور کرنا چاہئے......اس لئے سمجھاتے ہوئے بولا۔

نہیں رضیہ......ایسی بات نہیں......جس طرح تم نے یہاں بدبو دریافت کی ویسے ہی وہاں آفس میں مسز بھٹنا گر نے دریافت کی۔دراصل آج آفس میں ایک بھیانک واقعہ ہو گیا۔تم سلمہ کو تو جانتی ہو—؟'

رضیہ چونکی۔خوف سے جھرجھری لیتی ہوئی بولی۔''کیا ہوا سلمہ کو'

''اسے کسی درندے نے کاٹ کھایا ہے۔''

''آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا''

''ہاں رضیہ......سلمہ کی زندگی خطرے میں ہے......'' کریم بیگ نے ٹھہر ٹھہر کر سارا واقعہ دہرایا۔کچھ سوچتا ہوا بولا......میرے دماغ میں ایک خیال آیا

ہے—جس طرح یہ بدبو تم نے محسوس کی، مسز بھٹناگر اور دیگر نے محسوس کی۔ ویسے ہی اور لوگوں نے بھی تو محسوس کی ہوگی۔ رضیہ لگتا ہے یہ بدبو بیماری کی طرح ہر گھر میں پائی جا رہی ہے......آج دنیا میں ہزار طرح کے بم، ایٹم بم، نیوکلیر بم اور کیا کیا بنائے جا رہے ہیں......پھر یہ ہنگامے، فساد......تم سوچو رضیہ......بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد پورا ملک چشم آشوب میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ویسے ہی اس بدبو کو سمجھ لو......کچھ غلط ہو گیا ہے جو بدبو کی صورت میں آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا ہے......''

رضیہ کو جیسے تسلی ہوگئی۔ چپ سی ایک طرف بیٹھ گئی......انجم پھر باہر چلا گیا ......کمرے کی کھڑکی کھلی تھی۔ روشندان بھی کھلا تھا۔ بدبو کا بدمست جھونکا کمرے میں داخل ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا......جیسے کمرے کی ہر چیز سے بدبو اٹھنی شروع ہوگئی ہو......ٹیبل سے......دراز سے......ٹیبل پر رکھے ایش ٹرے سے—سوفا سیٹ سے۔ گلدان سے......گلدان میں رکھے تازہ پھولوں سے—بستر سے، تکیئے سے، ریڈیو سے، ہر طرف سے بدبو اٹھ رہی تھی۔

اور کریم بیگ سوچ رہے تھے......

یہ انکشاف تو بہت قبل ہو چکا تھا......

کہ ایک وقت آئے گا......جب بدبو کا تیز ریلا ہمیں اپنے شکنجے میں لے لے گا۔

ہماری میلی کچیلی باتیں ہمارے جسم سے لپٹ جائیں گی۔

ظلم کی زبان باہر نکل آئے گی۔

ہم چاروں طرف سے اپنی چھوڑی گئی چیخ کے نرغے میں ہوں گے۔''

ٹپ ٹپ آنسو۔ کریم بیگ کے رخسار پر پھیل رہے ہیں......زمانہ بدل گیا......اور بدلے ہوئے زمانے نے جو تیز بدبو چھوڑی ہے......وہ پوری تیز سے پھیلی جا رہی ہے۔

شہر شہر......ملک ملک......

(۳)

کریم بیگ جس وقت آفس میں داخل ہوئے۔ اس وقت آفس سے شور و غل کی تیز آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ سڑکوں پر بھی لوگوں کی بھیڑ جمع تھی—اچانک جیسے ہزاروں چیونٹیاں کریم بیگ کے جسم میں سرایت کر گئیں۔ وہ تیز قدموں سے بھیڑ ہٹاتے ہوئے آفس کی عمارت میں داخل ہوگئے......چاروں طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ ہاتھ کی مٹھیاں جذبات کی گرمی کے تحت بھینچ گئی تھیں۔ آنکھیں سرخ ہو کر آفس کی عمارت کو دیکھ رہی تھیں......

کیا ہو گیا ہے......کریم بیگ کو پہلے تو کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا......

شاہراہوں پر پہرے دیتے ہوئے بت اچانک خاموش ہو گئے تھے۔

صاحب کی گاڑی کا تیز ہارن گونجا......تھوڑی سی جگہ بنی اور فلک شگاف نعرے آسمان میں پرواز کر گئے......

ہر زور و ظلم کی ٹکر میں انصاف ہمارا نعرہ ہے۔

انصاف دو......انصاف دو......''

صاحب کی گاڑی تنگ راستوں سے گزر رہی تھی......اور چیخ کان پھاڑ رہے تھے......

ہم حساب مانگتے ہیں......

مس نیلی کے خون کا حساب—

پھر کئی آوازیں سنائی دیں......بڑا ہوگا اپنے گھر کا......غریب کی عزت بھی کوئی عزت ہوتی ہے......''

پھر نعروں کا ایک سیلاب آ گیا...... صاحب کی چھوٹی سی گاڑی اس سیلاب میں ڈوبنے ڈوبنے کو ہوگئی۔ چند لمحوں تک وہ کان میں انگلی دیئے، شور کے آوارہ بادل کو پرے کرتے رہے۔ پھر سائڈ کا دروازہ کھول کر باہر نکلے......

ان کے چہرے پر ایک شکن تک نہ تھی...... دھیرے سے مسکرائے۔

جو کہنا ہو...... میرے کمرے میں آ کر کہو۔''

چہرے لٹک گئے۔ نعرے دھواں دھواں ہو کر بکھر گئے...... صاحب نے پھر ایک فتح بھری نگاہ ان لوگوں کی جانب ڈالی...... اور ان کی بے بسی و بے چارگی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے تیز قدموں سے آگے بڑھ گئے۔

نعروں کا سیلاب پھر آ گیا تھا—

''ہم حساب مانگتے ہیں...... مس نیلی کے خون کا حساب۔''

''ہر زور ظلم کی ٹکر میں انصاف ہمارا نعرہ ہے۔''

''تانا شاہی مردہ باد''...... ایک آواز آئی

''افسر شاہی مردہ باد''...... دوسری آواز اٹھی۔

اور ادھر صاحب اپنے کمرے میں تیزی سے داخل ہوئے...... اب ان کے چہرے پر شکن ہی شکن تھی...... کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا— جب اطمینان ہو گیا تو ریوالونگ چیئر پر بچھ گئے۔ گہری سانس کھینچی۔ جیسے دماغ میں باہر کے شور داخل ہو گئے ہوں۔ سر کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا...... کرسی پر بیٹھے اور ٹیلیفون نمبر ڈائل کرنے لگے۔

ہیلو...... ہیلو...... پولیس اسٹیشن...... ہاں...... ہاں...... میں بول رہا ہوں...... کچھ پاگل قسم کے لوگ آفس میں گھس آئے ہیں— بیکار قسم کی باتیں کر رہے ہیں...... شور و غل اس قدر ہے کہ کان کا پردہ پھٹا جا رہا ہے...... پلیز آیئے...... ہاں

......بس یہی ڈر ہے کہ کہیں توڑ پھوڑ کی کارروائی نہ شروع کر دیں...... ہاں ابھی تک تو کچھ نہیں کیا ہے۔ مگر پاگلوں اور بیوقوفوں سے کیا امیدیں کی جا سکتی ہیں...... پلیز جلدی کیجئے...... انہیں سمجھایئے...... اچھا آپ چل رہے ہیں...... تھینکس گاڈ............ میں ٹھیک ہوں...... دروازہ اندر سے بند ہے...... ویسے اتنا یقین ہے یہ پاگل لوگ مجھ پر حملہ نہیں کریں گے...... انہیں کچھ سوکھی روٹیاں...... (قہقہہ)...... جو میں اُن تک ڈال دوں گا...... (دوبارہ قہقہہ)...... ٹھیک ہے......''

صاحب ٹھنڈے ہو کر ریوالونگ چیئر پر گھوم گئے...... پیشانی پر پسینے کی بوندیں جمع ہو گئی تھیں۔ رومال سے پسینہ پوچھا اور کمرے میں ٹہلنے لگے......

باہر سے اب بھی شور و غل کے بادل اٹھ رہے تھے......

کریم بیگ کو اپنی سانسیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں— اچانک وہ خود کو بہت ہی زیادہ تھکا ہوا محسوس کرنے لگے...... جیسے جسم میں ایک بھی قطرۂ خوں نہ رہ گیا ہو...... اندر ہزاروں بم پھٹ گئے ہوں— سر چکرانے لگا تھا...... ہاتھ پیر بالکل ٹھنڈے ہو گئے تھے...... انہیں یقین ہی نہ تھا...... معصوم، بھولی بھالی سلمہ اتنی جلد ان کے درمیان سے اتنی دور چلی جائے گی...... یہ گمان بھی نہ تھا کہ درندہ اتنی جلد اپنا کام کر جائے گا...... مگر ایسا ہو گیا تھا......

وہ آہستہ سے بند ہونٹوں میں بڑبڑائے...... انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سچ بات تو یہ تھی کہ سلمہ بہت پہلے ہی مر چکی تھی۔ وہ زندہ کب تھی—

پھر سوچنے کا سلسلہ اچانک منقطع ہو گیا۔

آفس کمپاؤنڈ میں پولیس جیپ کا ہارن گونج اٹھا......

نعروں میں اُٹھے ہوئے ہاتھ گر گئے— سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا...... اور سب ایسے خاموش ہو گئے گویا آنے والے نے موت کی سزا کا اعلان کر دیا ہے......

بھیڑ چھترا گئی...... جہاں موقع ملا، لوگ بھاگنے لگے__ انسپکٹر اپنی جیپ سے شاہانہ
وقار کے ساتھ اُترا...... ایک زہر بھری مسکان اُس کے ہونٹوں پر مچل رہی تھی۔

اُس نے انصاف کے متوالوں کو کچھ شک اور کچھ طنز بھری نظروں سے دیکھا
......اور پھر جیسے جی کھول کر ہنسا۔

ایک............

دو............

تین............

چار............

سب بھاگ گئے......

ہا......ہو...... بےقوفو...... بےوقوفو......

وہ ذرا دور پر سہمے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر چیخا...... یہ کیا ہنگامہ پھیلا رکھا ہے تم
لوگوں نے...... آفت مچا رکھی ہے...... جینا مشکل کر دیا ہے......

پاگلو! مجھے سب معلوم ہو گیا ہے

مس نیلی نے خودکشی کی ہے...... کسی نے مارا نہیں ہے اس کو

احمقو! اس طرح چیخنے چلانے سے کیا ملے گا تمہیں...... وہ تو کہو ہم شریف
ہیں کہ تمہیں گرفتار نہیں کر رہے...... ورنہ تم لوگوں کو تو......

انسپکٹر کے چہرے پر خون دوڑ گیا...... ''تمہیں تو شہر میں امن کو درہم برہم
کرنے کے الزام میں بڑے آرام سے گرفتار کیا جا سکتا تھا......

چہرے خوف سے سکڑ گئے...... بھیڑ چھٹنے لگی......انسپکٹر کے جملے نے بندوق
کی گولی سا کام کیا تھا...... لوگ ایک ایک کر کے واپس چلے گئے اور انسپکٹر فخر و غرور کی
علامت بنا مسکرائے جا رہا تھا......

اور کریم بیگ کو ایسا لگ رہا تھا...... جیسے انسپکٹر اپنے اُسی پرانے لہجے میں چیختا
ہوا کہہ رہا ہو۔

بےوقوفو......احمقو......گدھو......

دیکھا وردی کا کمال

دیکھا...... ہو نہ گئے ایک دو تین تم سب......

جیت گئے نا ہم...... اور تم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے......

میری وردی کو ملے ہوئے حقوق سے تمہارے نعروں کی ہوا نکل گئی__

پاگلو......ہا......ہہ......ہہ............

بھیڑ چھٹ چکی تھی......

آفس لان میں کچھ کام کرنے والے رہ گئے تھے...... اپنی ڈھیلی ڈھالی
مٹھیوں کے ساتھ...... جوش کا پرندہ آواز کی توپ سے مر چکا تھا۔ ہونٹ پر قفل لگ گئے
تھے...... آفس لان میں اب بھی پولیس کے سپاہی ادھر اُدھر ناچتے پھر رہے تھے......

انسپکٹر تیزی سے صاحب کے روم کی جانب بڑھا...... یہ بہت سے لوگوں
نے دیکھا...... پھر وہ اُسی شاہانہ چال سے واپس بھی لوٹ آیا...... جیپ میں بیٹھے
ہوئے اُس نے ایک نگاہ دوبارہ ان لوگوں پر ڈالی...... اور ایک گولی پھر داغ دی۔

آپ لوگوں کو وارننگ دی جاتی ہے...... آخری وارننگ...... آپ صاحب کو
تنگ نہیں کریں گے......ورنہ......

پھر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا__ لوگوں نے اُس کی سرخ آنکھیں دیکھیں اور
جیپ دھول اڑاتی ہوئی سڑکوں پر کھو گئی۔

''ورنہ......؟''

یہ آواز دیر تک گونجتی رہی__

رگھوبیر نے برا سا منہ بنایا...... پھر سب اکٹھا ہو گئے ...... ورما، مائیکل مسز بھٹنا
گر اور دیگر اسٹاف......

سب کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔

''دیکھا؟ کیسی دھمکی دے کر چلا گیا۔''

''ہمیں اپنے ہونٹ بند رکھنا ہے۔اسی میں بھلائی ہے۔''

''ہونٹوں پر تالے لگا کر ہم نہیں جی سکتے۔

''اب یہ سب بولنے سے کیا فائدہ''

کریم بیگ آگے آیا— جب بولنے کا وقت تھا تو تم خاموش ہو گئے......اب احتجاج بلند کرنے سے کیا ہوگا۔اپنے کٹے ہوئے ہاتھ دکھانے سے کیا ملے گا تمہیں؟''

اور سب نے محسوس کیا...... واقعی سب کے ہاتھ تو کاٹ ڈالے جا چکے ہیں ......آزادی کے باوجود یہ ہونٹ غلام ہیں ...... یہ ہاتھ غلام ہیں ......سب کچھ باس کے ہاتھ میں ہے اور یہ باس کی ہی آفس ہے...... وہ چاہے تو نکال باہر کر سکتا ہے......
اور جیسے مس نیلی چلی گئی اُسی طرح سب چلے جائیں گے......مگر......

''ہمیں کچھ کرنا ہوگا'' رگھوبیر کے چہرے پر خوف سمٹ آیا تھا۔

''یوں چپ رہنے سے ہمیں بھی بندوق کے نشانے پر لے لیا جائے گا۔''

رگھوبیر عقل سے کام لو'

کریم بیگ نے کانپتے ہونٹوں سے کہا...... ''رگھوبیر! یہ کچھ ہم کب سے کرتے چلے آرہے ہیں۔اس ''کچھ'' سے ہمیں کیا ملا۔جواب دو گے؟ سچ تو یہ ہے کہ یہ ''کچھ'' بہت کھوکھلا ہے رگھوبیر۔اس میں کوئی دم نہیں ہے۔''

کریم بیگ نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔ہم یہاں بے مقصد باتوں میں اپنا سر پٹک رہے ہیں اور وہاں ہاسپٹل میں مس نیلی کا پوسٹ مارٹم ہو رہا ہے۔

ذرا سوچو تو پوسٹ مارٹم''

کریم بیگ کی آنکھیں نم تھیں......معصوم سلمہ مرنے سے قبل خوش رہی نہ مرنے کے بعد......اس نے اسپتال میں ایسے کئی پوسٹ مارٹم ہوتے دیکھے ہیں......
اور لاوارث لاشوں کا پوسٹ مارٹم......گویا نیلامی کی بولی شروع ہوتی ہے۔

ایک......

دو......تین......

کوئی ہے......کوئی ہے اس کا وارث......

اور کوئی جواب نہیں ملے گا......تو لاش کو لاوارث قرار دے دیا جائے گا......

اور لاوارث لاش کتوں کے حوالے کر دی جائے گی—

کون پوچھتا ہے لاوارث لاشوں کو......؟

سلمہ کا کون وارث ہے......؟

کریم بیگ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھاتا جا رہا تھا......آواز ڈوبنے لگی۔

ریٹینا پر ایک مدھم تصویر اُبھری......اور ذہن جیسے ڈوبتا چلا گیا......

''رحیمو چا......میں نے زندگی میں بہت کم پڑھا۔مجھے نہیں معلوم روحیں دیکھا بھی کرتی ہیں یا نہیں ......اگر تم دیکھ رہے ہو تو میں سمجھ سکتا ہوں ......تمہاری آنکھیں سو سو آنسو بہا رہی ہوں گی......تم نے جس سلمہ کو سڑک کی بھیڑ میں کھو دیا تھا۔ مجھے ڈر ہے۔اس سلمہ پر مس نیلی کا لیبل لگا کر۔اور لاوارث قرار دے کر آگ میں نہ جلا دیا جائے۔میں ایک بار پھر اخلاق کی کمزوری کے درمیان گھر گیا ہوں......آواز اٹھاؤں یا چپ چاپ تماشہ دیکھتا رہوں۔اگر محض تماشہ دیکھوں تو ضمیر کے مسلسل عذاب سے کیسے چھٹکارا پاؤں......؟ عقیدے کی بے حرمتی کیسے گوارہ کروں......؟
میں فرق کے دوراہے پر نہیں کھڑا ہوں۔میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ ایک

بچے نے جس گھر میں آنکھیں کھولی ہیں۔اس بچے کو اسی گھر کا نام ملے......''

کریم بیگ کانپ گئے۔رگھو بیر وغیرہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔وہ بس اتنا ہی کہہ سکے......

''میرے عزیزو۔کیا تم لوگ مجھے ایک رکشے پر سوار کر سکتے ہو......؟''

میں تیز بدبو محسوس کر رہا ہوں۔میرا سر چکرا رہا ہے۔میں اسپتال جانا چاہتا ہوں۔مس نیلی کا آخری دیدار کرنے......

(۴)

اسپتال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا......جس وقت کریم بیگ اسپتال پہنچے اس وقت تک مس نیلی کے مرنے کی خبر سارے شہر میں عام ہو چکی تھی...... درندے کے کاٹ کھانے کی بات بھی لوگوں کو معلوم ہو گئی تھی۔کافی بھیڑ تھی۔ان میں اخبار والے بھی تھے۔فوٹو گرافرس بھی تھے۔سیاستدان بھی تھے......معصوم لوگ بھی—جس وقت کریم بیگ کا رکشہ وہاں رُکا اس وقت تک ساری رپورٹ سامنے آ چکی تھی......مگر کریم بیگ جانتے تھے......مس نیلی کو ایک زہریلے سانپ نے ڈسا ہے......کون ایسے زہریلے سانپ سے خود کو ڈسوانا پسند کرے گا......؟

دائیں طرف والے چبوترے پر مس نیلی کی ڈھکی ہوئی لاش پڑی تھی......

کریم بیگ اس منظر کی تاب نہ لا سکے۔آنکھیں موند لیں......درندے نے کس بے رحمی سے کاٹ کھایا ہے۔

فوٹو گرافرس جلدی جلدی تصویریں کھینچ رہے تھے۔پریس نمائندے اِدھر اُدھر لوگوں سے پوچھ تاچھ کرتے ہوئے چل رہے تھے اور جیسا کریم بیگ نے سوچا تھا۔ٹھیک ویسا ہی منظر سامنے تھا۔انسپکٹر، ڈاکٹر سے گفتگو کرتا ہوا کہہ رہا تھا۔

''لاوارث لاش ہم لوگوں کے لئے ایک پرابلم بن جاتی ہے......''

اور انسپکٹر نے نیلامی کی بولی شروع کی......

ایک......

دو......

تین......

چار......

پانچ......کوئی ہے......کوئی ہے......

اور اس درمیان ایک عجیب سا واقعہ ہوا......کریم بیگ میں جانے کہاں سے جوش آ گیا۔وہ آگے بڑھا اور اطمینان سے بولا......

''لاش میرے سپرد کر دی جائے......اس لاش کا اکیلا وارث میں ہوں''

''تم......؟

انسپکٹر نے خونی نظروں سے اس کا جائزہ لیا......

کریم بیگ کو پھر ویسا محسوس ہوا۔جیسے وقتی طور پر وہ پھر قہقہوں کی زد میں آ گیا ہو......انسپکٹر اُسی پرانے انداز میں ہنستا ہوا کہہ رہا ہو...... پاگل...... کتے...... وحشی......تو تم ہو......تم ہو کمینے......احمق......تم ہو......

وہ واقعی احمق تھا، جبھی تو کہہ رہا تھا۔اُس کے اندر اطمینان بھرا تھا۔معصومیت سے بولا...... ہاں میں ہوں انسپکٹر صاحب—اگر میں وقت پر نہ آتا تو ایک بہت بڑی غلطی ہو جاتی۔

انسپکٹر طنز سے ہنسا......اور اگر دیر سے آتے تو شاید ایک بہت بڑی غلطی ہونے سے بچ جاتے......

''کون ہے یہ؟ کیا رشتہ ہے اس سے تمہارا؟

انسپکٹر کی آنکھیں اس کے جسم میں پیوست ہوگئی تھیں......

''میری بہن—'' اس نے آہستہ سے کہا......

''اب تک کہاں تھے۔ تم نے اپنی بہن کی گمشدگی کی رپورٹ کیوں نہیں درج کرائی تھی......؟

اس نے سر جھکالیا......

انسپکٹر دوبارہ غصے میں بولا......جس وقت مس نیلی کی لاش ہم نے برآمد کی۔ اس وقت تم کہاں تھے؟......

وہ پھر چپ رہا......

''جب لاش کا پوسٹ مارٹم ہورہا تھا، اس وقت تم کس گپھا میں چھپے ہوئے تھے؟''

وہ تابڑتوڑ سوال کئے جارہا تھا اور کریم بیگ ہر سوال کے جواب میں جھکا جا رہا تھا۔

انسپکٹر پھر چیخا......''کیا نام ہے تمہارا؟''

''کریم بیگ!''

اب کی بار انسپکٹر بڑے زور سے چونکا...... اور عجیب نظروں سے اُس کی طرف دیکھا......مسلا ہو......

'ہاں'

''مسخری کرتے ہو..........مس نیلی تمہاری بہن کیسے ہوگئی......؟''

وہ سمجھ گیا......انسپکٹر نے اسے پوری طرح اپنے چنگل میں لے لیا ہے۔ موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے خوف سے بولا۔

''میں بتاتا ہوں......سب بتاتا ہوں......مگر ایک وعدہ کیجئے— آپ مس

نیلی کو ہمیں سونپ دیجئے گا......تاکہ ہم اپنے طریقے سے آخری رسوم کرسکیں—

کریم بیگ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں......

انسپکٹر کی آنکھوں میں گدھ جیسی چمک تھی—

''نہیں ...... میں یہ وعدہ نہیں کرسکتا ......تم تو کوئی بہروپئے لگتے ہو بہروپئے۔

اس پر جیسے بجلی گر پڑی......خود کو بحال کیا......اعتماد کو ہاتھ سے جانے نہ دیا ......ہمت کی اور جو کچھ صحیح تھا......وہ پٹاری کھول کر وردی والے صاحب کے سامنے رکھ دی۔

''اوہ!'' انسپکٹر نے ایک گہری سانس کھینچی— پھر معنی خیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔

''تمہاری اس بات کا کیا ثبوت ہے۔ پھر ثبوت کے بغیر ہم تمہاری بات پر کیونکر یقین کریں۔ تم سچ مچ بہروپئے ہو۔ ڈھونگی ہو...... جانتے بھی ہو۔ اگر تمہارے اس جھوٹ کو تھوڑی سی بھی ہوا مل گئی تو کیا ہوسکتا ہے۔ دنگے ہوسکتے ہیں۔ فساد ہوسکتے ہیں۔ منٹوں میں ہنستا کھیلتا یہ شہر شعلوں میں گھر بھی سکتا ہے......تم کوئی خطرناک آدمی لگتے ہو......کسی بھیانک سازش میں ملوث نظر آتے ہو۔

اس کی آنکھیں خونی ہوگئیں......

''بتاؤ کس تنظیم سے تعلق ہے تمہارا؟''

کس کے لئے کام کرتے ہو؟۔

یہ کہانی کیوں گڑھی۔؟

کس نے ایسا کرنے کو کہا......؟

تم اس لاش کے ساتھ کھلواڑ کرنا چاہتے ہو......ہم تمہاری سازش اور سوچ

سمجھی اسکیم کو پنپنے نہیں دیں گے...... اس کا انتم سنسکار اس کے نام کی مناسبت سے ہوگا۔ سمجھے...... سمجھے...... سمجھے......؟''

کوئی چاقو لے کر وحشت اور درندگی سے اُس کے سارے جسم پر وار کرتا چلا جا رہا تھا۔ سمجھے...... سمجھے—— کریم بیگ گونگا بن گیا تھا۔ آواز کا طائرانسپکٹر کے حملوں کی تاب نہ لا کر فضا میں پرواز کر چکا تھا۔ اس کی چبھتی آنکھیں کریم بیگ کے اندر اندر گھس گئی تھیں۔ وہ بھی کتنا پاگل ہے...... اور کیا ثبوت ہے اُس کے پاس...... خود مس نیلی نے بھی تو اپنے ساتھ ایک سمجھوتہ کر لیا تھا۔ مگر وہ رحیمو چا کی محبت کے آگے سمجھوتا نہ کر سکا۔ بس یہی غلطی تھی اس کی...... اس نے گویائی سے محروم ہونٹوں کو آواز دینے کی جرأت کی تھی...... یہی جرم تھا اُس کا...... یہ بھول گیا تھا...... کہ آزادی کے بعد نافذ ہوئے قوانین میں سے ایک قانون یہ بھی ہے۔ ہونٹوں پر سِل رکھ کر جیئو...... آنکھوں کو بند کر کے جیو...... ورنہ قید...... حراست...... خاکی وردی والوں کو ملے حقوق پھانسی اور عمر قید کی سزا سنانے کو منتظر ہیں۔ بڑی بڑی موٹی کتابوں سے گناہ کی لمبی چوڑی تفصیل بالآخر کھوج نکالی جائے گی...... اور پھر اُس کی سانسوں پر پہرہ بٹھا دیا جائے گا۔

اچانک وہ اس وقت چونکا...... جب انسپکٹر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا......

''مجھے افسوس ہے...... تمہیں گرفتار کرنا پڑ رہا ہے......''

کریم بیگ نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اُس کی جانب بڑھایا...... نقاہت سے ایک ڈوبتی سانس لی۔ پھر دھیرے سے مسکرایا......

''فاتح ہوئے تم انسپکٹر کہ تمہیں ثبوت مل گیا...... میں واقعی بہت بڑا مجرم ہوں کہ مس نیلی کو مسلمہ ثابت کرنے کا ایک چھوٹا سا ثبوت بھی فراہم نہ کر سکا۔ فطرت نے اگر وہیں سے بچے کے جسم پر اس کی قومیت کے نشان ثبت کر دئے ہوتے تو آج

اس کی ضرورت نہ پڑتی...... میں خود تمہیں دکھاتا۔ مگر افسوس کہ بچہ اپنے ساتھ اپنی قومیت کا ثبوت نہیں لاتا۔ مس نیلی نے مجبوریوں کے تحت نام تو بدل دیا...... مگر اپنے نام کی نشانی اپنے جسم پر محفوظ نہ رکھ سکی...... افسوس میں سچ کا کوئی ثبوت نہیں لا سکا...... اور تم میرے گناہ کے ثبوت لئے بیٹھے ہو...... کہ تمہاری وردی سے...... وردی کو ملے حقوق سے...... حقوق سے جسم میں پلنے والے ایک ایک خون کے خطرہ سے غرور اور تانا شاہی کی بو آ رہی ہے...... تم اپنی کمزوریوں پر اپنی وردی کا بوجھ رکھنا چاہتے ہو تو رکھ لو۔ مگر دیکھ لینا......

کریم بیگ ہانپ رہا تھا...... دیکھ لینا...... ایک نہ ایک دن میں اپنی کمزوری پھینک کر انجم بن جاؤں گا...... اور تمہارے بدن سے تمہاری وردی کھینچ کر تمہارے جسم میں پلنے والے ایک ایک گھاؤ دکھاؤں گا...... وردی کے بغیر جھکا ہوا تمہارا سر دکھاؤں گا۔ تمہارے اندر رینگتے ہوئے کیڑے دکھاؤں گا...... دکھاؤں گا کہ وردی کے بغیر تمہاری کیا حیثیت ہوتی ہے...... تمہاری آواز کس قدر کمزور پڑ جاتی ہے۔ کتنے کمزور ہو...... تم......؟

مگر کریم بیگ کچھ بھی نہ کہہ سکا......

آسمان مٹ میلا ہو گیا تھا...... چاروں طرف دھواں ہی دھواں بکھر گیا تھا...... بادلوں کے ٹکڑے اڑے جا رہے تھے۔ بارش کا امکان پیدا ہو گیا تھا......

مگر کریم بیگ تو کچھ اور ہی دیکھ رہا تھا۔

''میں ہار گیا ہوں رحیمو چا...... میں ہار گیا...... ان لوگوں نے لوہے کے موٹے سنگلاخ دستانے مجھے ضرور پہنا دیئے ہیں۔ تاہم مجھے خوشی ہے کہ میں اپنے اخلاق کی کمزوریوں کا مجرم نہیں بنا...... میں نے اس دائرے کو توڑ کر ایک مضبوط احتجاج بلند کیا ہے...... یہ بات الگ ہے...... کہ میرے سچ پر ثبوت کے زنگ آلود آئینے کو دکھانے کا حکم صادر کیا گیا ہے۔ تاہم میں نے اپنی آواز بلند کر دی ہے...... اور

میں دیکھ رہا ہوں...... یہ اخبار رپورٹر...... یہ نامہ نگار...... یہ نمائندے......میری جانب جن نظروں سے دیکھ رہے ہیں......ان نظروں میں ایک آگ کودتی پھر رہی ہے...... ان کے انصاف پسند ہاتھوں سے اس ناانصافی کی تلافی ہوسکتی ہے......اور میں جان رہا ہوں...... یہ چپ نہیں بیٹھیں گے...... یہ خاموش نہیں رہیں گے۔میرا احتجاج اگر ان کی آواز کا ایک حصہ بھی بن گیا تو یہ دھوئیں کا بادل ایک نہ ایک دن پورا آسمان ضرور بن جائے گا......جو زور و ظلم کے خلاف جنگ کے بگل کو بجادے گا......

کریم بیگ ہذیان میں بولے چلا جارہے تھا......

میں خوش ہوں رحیمو چا......کہ میں جیت گیا ہوں۔

آزادی کے اتنے سالوں کے بعد۔اس زہریلی فضا میں بھی۔ایک مرد مجاہد نہیں ہارا۔اس نے اپنی آواز بلند کردی ہے۔

اور سلمہ......

مس نیلی......

تم بھی......الوداع......الوداع......کہ تم نے دنیا کی گندگی یہاں اتار پھینکی ......اب چاہے تم جس رسم سے بھی گزرو......تمہاری روح نئے سفر کے لئے بدن چھوڑ چکی ہے......مجھے یقین ہے— تمہاری پاک مقدس روح پر ایک شکن تک نہ آئے گی......

جاؤ سلمہ......الوداع!

یہ لوگ بھلا میری آواز کیونکر سمجھیں گے۔یہ پاگل کتے جو مالک کے اشاروں پر ناچتے ہیں......شعبدہ گر کے ہاتھ کی حرکت سے ڈولتے ہیں— یہ بھلا میرے دل و دماغ سے اترے ہوئے بوجھ کو کیونکر دیکھ سکتے ہیں۔میری روح سے ہٹی ہوئی میلی کچیلی عفریت کی بو کیونکر سونگھ سکتے ہیں۔

وہ ہانپ رہا تھا......سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھے جارہے تھے اور سوچ

رہے تھے......کیا یہ سچ مچ پاگل ہوگیا ہے......یا سچ مچ پہلی بار آج انسان بن گیا ہے......

مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا......اور کریم بیگ کہہ رہا تھا......

''لے چلو......کہاں لے چلو گے مجھے۔''

اُس کے لہجے میں ایسا غرور بھرا تھا کہ وردی کانپ گئی اور وردی والا ہکا بکا اُسے دیکھنے لگا......آنکھیں چوندھیا گئیں—

کریم بیگ کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔وہ سوچ رہا تھا......آج واقعی میرے لئے بڑی خوشی کا دن ہے......آج میں نے مذہب کا وہی سچ پی لیا ہے ......جو میں نے عرصہ سے فراموش کررکھا تھا کہ زندگی کی اس طویل دوڑ میں موت کو اپنی مٹھی میں بند کر کے نکلو......مگر الٹا ہم موت کے خوف سے زندگی کی طویل دوڑ میں پیچھے۔اور مسلسل پیچھے ہوتے چلے گئے۔مگر اب اس کینچلی کو اتار دینے کا وقت آ گیا ہے......اب مجھے کسی کا ڈر نہیں۔میں جانتا ہوں میرے ہونٹ سے نکلا ہوا ہر کلمہ سچ کا کلمہ ہوگا۔

کریم بیگ مسکرایا،طنزیہ نظروں سے انسپکٹر کو دیکھا......پھر بولا۔تم اس سچ کی زبان نہیں کاٹ سکتے۔سمجھے تم نہیں کاٹ سکتے......!......

خاکی وردی والے کا سر جھک گیا......

اور دیکھنے والے نے دیکھا......ایک جھکا ہوا سر......نقاہت میں ڈوبی آواز ......اور کریم بیگ کا شان سے تنا ہوا جسم......اور دیکھنے والوں نے محسوس کیا۔ایک قیدی بادشاہ......کہ سچ بولنے کے نام پر جسے سلاخوں میں جکڑ دیا گیا تھا...... جب برسوں بعد رہائی ملی،سچ کا تبسم اس کے ہونٹوں سے جھلک رہا تھا......

کریم بیگ مسکرائے جارہا تھا۔

اور سب حیرت سے دیکھے جارہے تھے......

(۵)

شام کی سیاہی آسمان میں چھا گئی تھی۔آسمان آج صبح سے ہی ابر آلود تھا۔گھٹا چھائی ہوئی تھی اور پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

بارش اسی وقت سے شروع ہو چکی تھی جس وقت کریم بیگ کو فسادی ہونے کے الزام میں جیل لے جایا گیا تھا۔جیل کی سلاخوں کے باہر کئی سر تھے۔جو جھکے تھے۔غم میں ڈوبے تھے......بعض میں ہمدردی کے آثار تھے......اور بعض اس کی داد دے رہے تھے......کریم بیگ اس وقت گھر کے خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔انہوں نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ کسی کو جیل میں ملنے کے لئے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔دوستوں کو بار بار سمجھایا تھا......کہ انجم نادان ہے۔اُسے روکنا......ایسا نہ ہو کہ جوانی کے جوش میں وہ غلطی کر جائے۔رضیہ کو بھی سمجھا دینا......کہ میں جیل کسی غلط مقصد سے نہیں گیا ہوں بلکہ سچ کے نام پر گیا ہوں ......رگھو بیر کانپتی آواز میں بولا تھا......کریم تو تو ہم سب سے بازی لے گیا......مس نیلی سے ہم سبھی کو محبت تھی......مگر محبت کی یہ قربانی تیرے نام لکھی گئی......آج معلوم ہوا، سچ کے نام پر زہر پینے والے سقراط کی کمی نہیں......

وہ صرف ہنس کے رہ گیا تھا......

پھر اُسے دیکھنے والوں کا ایک تانتا لگ گیا......وہ اس ناٹک سے اب پوری طرح اوب چکا تھا......

جیل کی وہ پہلی رات......وہ اُس بدبو کو محسوس کر رہا تھا۔جو تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی......وہ ان چہروں سے بھی خوب واقف ہو چکا تھا۔جو تنہائی میں اُس سے لمبی چوڑی گفتگو کیا کرتے تھے۔مگر جھوٹ کے اسیر تھے۔جن کے چہرے سہمے تھے اور

درندے کا خوف جنہیں کھائے جا رہا تھا۔

جیل میں تو ایسا کچھ بھی نہ تھا جس سے وہ خوف محسوس کرتا......اطمینان بھرا تھا ماحول میں—

بارش کی موسیقی وہ دیر تک سنتا رہا۔پھر اُس کو نیند آ گئی۔جب اٹھا تو صبح ہو چکی تھی......اس نے ایک انگڑائی لی......آنکھوں کی دھند ہٹائی...... باہر کے شفاف منظر کا جائزہ لیا۔قیدیوں کی طرف دیکھا......یہاں تک کہ دس بج گیا......اور اُسے معلوم ہوا......اسے آزاد کر دیا گیا ہے۔

صاحب نے ضمانت لی ہے اُس کی۔

اُس نے سر کو جھٹکا دیا......پھر جیل کی دیوار سے باہر نکل آیا۔جہاں رگھو بیر اُس کا منتظر تھا۔چہرہ اترا ہوا تھا......

’’تم ٹھیک تو ہو نا کریم بیگ......؟‘‘

کریم بیگ مسکراتا ہوا بولا......تمہارے سامنے کھڑا ہوں—بالکل بھلا چنگا۔‘‘

رگھو بیر نے ٹھنڈی سانس لی......میرا یہ مطلب نہیں تھا۔لوگ کہتے ہیں ایک بار جیل چلے جانے سے عزت پر آنچ آ جاتی ہے......

’’بیوقوف ہیں ایسے لوگ جو الزام اور اس کی روشنی پر غور نہیں کرتے۔‘‘

کریم بیگ کی آنکھیں چمک اٹھیں......‘‘اور پھر میں تو سچ کے نام پر جیل گیا تھا۔‘‘

’’خیر! کل تمہیں صاحب نے بلایا ہے......آؤ گے نا......؟‘‘

’’ضرور......‘‘

رگھو بیر چلا گیا......اور وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

رضیہ کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں......اُس کے دل میں آیا......

کہ کہے......انجم ان مٹھیوں کو اور کس کر بھینچ لو......اب اس کی ضرورت ہے۔

مگر انجم کا چہرہ دیکھ کر ڈر گیا......گلا تر ہوا تو آنکھیں پھر انجم کی طرف اٹھ گئیں—

''ابا...... یہ جو کچھ ہوا اچھا نہیں ہوا......اچھا نہیں ہوا۔''

اُس کی آنکھوں میں ایک خوفناک سانپ پھن مارے بیٹھا تھا۔ ابا......آخر اس کی ضرورت ہی کیا تھی......کیا یہ نام کا چکر ختم نہیں ہوسکتا ابا۔ وہ سلمہ ہو......چاہے مس نیلی......وہ مرگئی ہے......حقیقت تو بس یہی ہے نا ابا......پھر آخری رسوم کے لئے آپ نے آواز ہی کیوں اٹھائی......میں پوچھوں گا ابا۔ ضرور پوچھوں گا......کیونکہ مجھے ان وردی والوں سے سخت نفرت ہے جو خود کو ملے ہوئے حقوق کے بل پر سمجھتے ہیں کہ حکومت بن گئے ہیں......آپ سچ کے لئے لڑے ابا مگر کیا ملا......؟''

انجم کی آواز میں سانپ کی پھنکار شامل تھی۔

کریم بیگ کافی دیر بعد بولے...... یہ خبر مجھے معلوم تو نہیں تھی مگر میں جانتا تھا ...... کہ یہ لوگ ایسا ہی کریں گے۔ سلمہ نے اپنے بدن کی کینچلی اتار پھینکی۔ اور اس کی مقدس روح نئے سفر کے لئے پرواز کرگئی......

کریم بیگ ٹھہرے......آہستہ سے بولے......میں صرف یہ چاہتا تھا کہ اس نے جس مذہب میں آنکھیں کھولیں، اُسی مذہب کے ساتھ اسے آخری سفر پر روانہ کیا جائے—

کریم بیگ کا گلہ بھر آیا......انجم نڈھال سا کمرے میں ٹہلنے لگا......رضیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔

کریم بیگ نے انجم کی جانب دیکھا......

''انجم میں جانتا ہوں تم نئے عقیدے کے نئے شہر میں پیدا ہوئے ہو......

مذہب سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مگر انجم ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں......ایک بچے نے جس گھر میں جنم لیا ہے......اُسی گھر کی مٹی ملنی چاہئے نا اُسے......؟ سلمہ نے نام بدلا تھا قومیت تو نہیں بدلی تھی۔

'شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔' انجم آہستہ سے بولا......

مگر انہوں نے جو سلوک آپ کے ساتھ کیا ہے، میں اُسے زندگی بھر فراموش نہیں کر پاؤں گا—''

اتنا کہہ کر وہ رکا نہیں، تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا—

(۶)

سڑکوں پر جس رفتار سے گاڑیاں دوڑا کرتی ہیں، کریم بیگ کا ذہن اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ آفس کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ہی وہ سمجھ گئے تھے کہ آج کس قسم کے سوال و جواب سے ان کا پالا پڑے گا......اور اس لئے انہوں نے خود کو پوری طرح سے تیار بھی کر لیا تھا......جیل کی چہار دیواری کے اندر ہی وہ پرانا کریم بیگ مر چکا تھا......وہ ڈر پوک ڈر پوک سا......سہا سہا سا کریم بیگ...... صاحب کے دروازے پر خوف و دہشت کا مجسمہ— اندر بلائے جانے کا منتظر— کریم بیگ...... جسے پل پل یہ ڈر کھائے رہتا کہ کہیں صاحب کی ناراضگی اس کی چھٹی کا سبب نہ بن جائے۔

''مگر اب کریم بیگ مضبوط ہو چکا تھا— اُس نے اپنے جسم کا جائزہ لیا— اور مسکرایا......

اب یہ ہاتھ اُس کے ہیں......

پاؤں اس کے ہیں......
جسم اس کا ہے......
اور اس کی آواز پر بھی اب صاحب کا کوئی اختیار نہیں رہ گیا ہے......
اندر کا سارا میں صابن کے جھاگ کی طرح بہہ اٹھا۔

آفس چلتے وقت اس نے گھر کے لوگوں کو بھی ایک لمبا چوڑا بھاشن دیا تھا۔ جس کا مفہوم بس اتنا تھا...... کہ گھر کا کوئی بھی فرد کسی پر بوجھ نہیں ہے...... کسی کی خاطر زندہ نہیں ہے ...... سب خود مختار ہیں ...... سب اپنی حیثیت اور انا کے ساتھ زندہ ہیں—وقت جیسا موڑ دے گا ویسے ہی عقل سے کام لے کر ڈھلنا ہوگا...... کبھی کمزور نہیں بنیں گے......

وہ گھر سے یہی سوچ کر چلے تھے کہ صاحب نے اگر زیادہ ہنگامہ کھڑا کیا تو وہ نوکری سے استعفیٰ دے آئیں گے مگر اپنے اخلاق کی کمزوریوں کے ساتھ آفس کی چہار دیواری میں خود کو قید نہیں کریں گے......

اُنہوں نے اُس درندے کی شکل بھی دیکھ لی تھی جو اُن کے تعاقب میں تھا مگر انہیں یقین تھا کہ جب تک اُن کی مضبوطی قائم ہے۔ یہ درندہ اُن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا...... صاحب کے دروازے کے پاس آ کر بھی وہ خوفزدہ نہیں تھے— بلکہ مضبوط انگلیوں کے ساتھ دستک دی—اور وہ دھڑ ادھڑاتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

''بیٹھو......''

باس ریوالونگ چیئر پر خود کو گھمانے لگا...... میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا کریم!

اتنا کہہ کر ٹیبل پر پڑا ہوا پیپر ویٹ اٹھا لیا۔ اور اُسے گھمانے لگا— پھر کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے—ماتھے کی لکیریں گہری تھیں...... آہستہ سے بڑبڑایا۔

''میری سمجھ میں نہیں آیا کریم! تم نے ایسا کیوں کیا...... کیوں کیا......

کریم بیگ نے سر جھکایا۔ آہستہ سے بولا ''سر! سلمہ میری بہن تھی۔''

''میں نے سنا...... مگر تم نے کبھی بتایا نہیں— کبھی ذکر نہیں کیا۔''

''اس کی وجہ تھی سر۔۔۔ سلمہ میری بہن ضرور تھی۔ مگر مس نیلی کی مجبوری نے یہ رشتہ توڑ ڈالا تھا۔''

''پھر بھی کہتے ہو کہ وہ تمہاری بہن تھی۔'' صاحب پریشان ہو گئے۔

اور کریم بیگ آہستہ سے مسکرا دیا۔

''سر! اگر باپ بیٹوں میں وقتی طور پر کوئی جھگڑا ہو جائے تو کیا جھگڑے کی بنا پر رشتے ٹوٹ جائیں گے۔ تعلقات ختم ہو جائیں گے......؟

''ہونہہ!''

صاحب نے ایک لمبی سانس لی۔'' مگر وہ تمہاری سگی بہن تو نہیں تھی۔''

''وہ رحیمو چاچا کی بیٹی تھی...... جو میرے خاندان کے وفادار رہے تھے اس لئے وہ مجھے سگی بہن سے زیادہ عزیز تھی۔''

''اوہ''

صاحب دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئے اور پیپر ویٹ گھمانے لگے۔ ایک سوال رہ رہ کر اُن کے دل میں چبھ رہا تھا تھا۔ کہ وہ کریم بیگ سے یہ پوچھیں کہ تم اس درندے سے واقف ہو؟ جس نے مس نیلی کا لہو چوسا ہے۔ مگر وہ اچھی طرح سے سمجھ رہے تھے۔ کریم بیگ اس سوال کا جواب بھی اُسی دیدہ دلیری سے دے گا...... یس سر! میں جانتا ہوں...... مگر ابھی کہنے کا وقت نہیں آیا۔

صاحب نے پیپر ویٹ گھما کر چھوڑ دیا...... پیپر ویٹ ٹیبل پر تھوڑی دیر تک گھومتا رہا۔ پھر ٹھہر گیا۔ صاحب کو اپنی قوت کا اندازہ بہر طور تھا۔ ان کی پہنچ بہت دور

تک تھی...... پھر کون تھا جو ایک بال بھی بانکا کرتا اور کٹھ پتلیوں کو تو اپنے انداز میں گھمانے کی ان کی پرانی عادت تھی ـــــ آہستگی سے مسکرائے ـــــ پھر کریم بیگ کی آنکھوں میں جھانکا......

ٹھیک ہے کریم بیگ! یہ تمہارا ذاتی معاملہ ٹھہرا......اس لئے اس معاملے میں دخل دینے والا میں کون ہوں ......مگر ایک بات ضرور کہوں گا ......اب جب کبھی قدم اٹھاؤ......تو بہت سوچ سمجھ کر اٹھاؤ...... یہ جان لو کہ راستے میں چاروں طرف زہریلے سانپ پڑے ہیں۔کوئی بھی سانپ تمہیں ڈس سکتا ہے۔ہلاک کرسکتا ہے......

''ٹھیک ہے سر! میں اس بات کا پورا پورا خیال رکھوں گا'' اتنا کہہ کر وہ صاحب کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

جب وہ اپنے روم میں لوٹے تو لوگ اُس کی واپسی کے منتظر نظر آرہے تھے......دیکھتے ہی سوال داغا گیا......

کیا ہوا کریم بیگ؟''

''کچھ نہیں۔''

اس نے اطمینان سے جواب دیا......صاحب نے ایک مشورہ دیا......سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا......بس اور کوئی بات نہیں ہوئی ...... ہاں اتنا ضرور کہا......کہ راستے میں چاروں طرف سانپ ہی سانپ پڑے ہیں، ہشیاری سے چلنا چاہئے ...... ورنہ......''

''کیا یہ دھمکی ہے......؟''

''دھمکی نہیں......صاحب نے احتیاط کا راستہ چننے کو کہا ہے''

''اور تم نے مان لیا''

''کیا کرتا۔ صاحب ہی نے میری ضمانت لی تھی ...... کیا نوکری چھوڑ

دیتا...... بلاوجہ صاحب سے لڑ پڑتا......؟ بتاؤ تم لوگ؟''

''نہیں ہمارا یہ مطلب نہیں۔''

رگھوبیر پھسپھسایا......''میرے دوست! جانے کیوں ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے ہم سب نامعلوم خطرات میں گھر گئے ہوں۔ ہماری ذہنی حالت اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ ہماری مدد کرو یار......'

سب قریب سمٹ آئے۔

''آج شام میں رمنا میدان کے قریب والے ہوٹل پارک ویو میں ہم سب جمع ہو رہے ہیں ـــــ تم ضرور آنا...... وہیں تبادلۂ خیال کریں گے کہ آنے والے نا معلوم خطرے سے کیسے بچا جاسکتا ہے......

''ٹھیک ہے......میں ضرور آؤں گا۔''

دوستوں کے جھرمٹ سے نکل کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔ دوستوں کی گھبراہٹ پر ندامت کا احساس ہو رہا تھا......آج ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی......اللہ گواہ ہے...... یہ تو ایک بہن کا مسئلہ تھا۔بہن جو اس کی سگی نہ تھی مگر یہی کیا کم تھا کہ اس نے اُسی کے گھر میں پرورش پائی تھی...... یہ رشتہ کچھ کم کیا ہے......مگر اس کے باوجود یہ تنگ نظری کی آگ۔

یہ آگ پھیل رہی ہے...... یہ آگ پھیل جائے گی......

کریم بیگ کے دل و دماغ میں طوفان آیا ہوا تھا......اخبار ٹیبل پر دوبارہ ڈال دیا۔سر پکڑے پکڑے کافی دیر تک بیٹھے رہے۔پھر چھٹی کی درخواست لکھی۔ طبیعت واقعی خراب ہو رہی تھی۔اس لئے گھر چل دیئے۔

راستے بھر رگھوبیر، ورما، اور مائیکل کے سہمے چہرے اُن کی نگاہوں میں گھومتے رہے...... کتنے معصوم ہیں یہ لوگ......گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے یہ

چہرے — کبھی خوشی کا عکس ......کبھی غم کی لمبی ہوتی پرچھائیں ......آج پھر نا معلوم خطرات میں گھر گئے ہیں......مگر۔کیا محفوظ رہ سکیں گے — ؟

وہ جو شعبدہ گر ہے۔

اپنے وقت کا سب سے بڑا جادوگر۔

کیا وہ ان معصوم لوگوں کو اپنے ہپناٹزم کا شکار نہیں بنائے گا؟ ان کی آنکھوں کو چکا چوند نہیں کرے گا۔؟

وہ جو برسوں سے شعبدہ گر کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں رہے ہیں......اچانک برسوں کی غلامی کا یہ طوق کیسے اتار پائیں گے......

طلسم ہوش ربا کی عورت اُن کا دھیان کھینچ ہی لے گی اور جب پلٹ کر دیکھیں گے تو پتھر بننا ہی ہوگا......

کہ سب کے سب معصوم شہزادوں کی طرح اُس طلسمی عورت کی قید میں ہیں......

وہ مٹھیوں میں بھر کر اشرفیاں چھترائے گی۔ یہ پاگل کتوں کی طرح پیچھے ہو لیں گے......

مگر وہ دن......وہ دن...... جب اُس جابر طلسمی عورت کی لاش پڑی ہوگی۔ اور طلسم کی زد میں آئے شہزادے اپنی اصلی شکل میں لوٹ آئیں گے۔

اس دن کا انتظار رہے گا......

ہوٹل پارک ویو میں سب آچکے تھے......صرف مسز بھٹنا گر کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا......بیرا ٹیبل پر چائے رکھ کر جا چکا تھا۔سب نے ہاتھوں میں کپ تھام لیا......

رگھو بیر نے خاموشی کو توڑا......

''آج یہ چھوٹی سی میٹنگ ہمارے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ ہم

سب نا معلوم خطرات میں گھرے ہوئے ہیں......ہم نے آفس کے اندر اور باہر صرف قہقہے اچھالے ہیں......خوف کا سامنا کبھی نہیں کیا...... یہ بھی کبھی نہیں جانا کہ خوف ہوتا کیا ہے؟ کس بلا کا نام ہے؟ مگر اب جانے کیوں ......شاید مس نیلی اور درندے کی جھڑپ......پھر مس نیلی کی بدترین موت سے یہ عقدہ ہم سب پر کھلا ہے...... کہ ہم نا معلوم خطروں میں گھر گئے ہیں......اور اسی خطرے نے ہم سے ہمارے زندہ دل قہقہے چھین لئے ہیں۔ دلوں میں نا معلوم خوف برپا کر دیا ہے۔ہمیں اس خوف کو ہٹانا ہے......اس نا معلوم خطرے سے بچنے کے لئے جو تدابیر ہو سکتی ہیں۔اُسی کو سامنے لانے کے لئے یہ اہم میٹنگ بلائی گئی ہے......''

اتنا کہہ کر رگھو بیر چپ ہو گیا......اور ناٹے قد کا ورما اٹھ کھڑا ہوا—

''میرے دوست اسب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ نا معلوم خطرہ ہے کیا؟''

مائیکل نے خوف سے کہا—— ''وہی درندہ جو ہمارے آس پاس ہر وقت موجود رہتا ہے ...... گھر پر ......سڑکوں پر ......آفس کے اندر — باہر ...... ہر وقت ہمارے تعاقب میں ہوتا ہے......بستر پر بھی ہمارے ساتھ سوتا ہے......وہی درندہ...... خوف صرف اسی کا ہے—''

'مگر وہ درندہ جب نظر نہیں آرہا ہے تو ہم اسے کیسے مار سکتے ہیں؟'

اس فالتو بحث سے کریم بیگ اکتا چکے تھے۔اس لئے بولے......

'' وہ درندہ کون ہے ...... اس سے ہم سب واقف ہیں ۔ یہ الگ بات ہے......خوف اور دہشت کے ملے جلے جذبے نے ہمارے ہونٹ سی رکھے ہیں......

وہ ذرا دیر کو ٹھہرے پھر دوستوں کی آنکھوں میں جھانک کر بولے—

''میرے دوستو! ہم یہاں آفس کی عمارت سے کافی فاصلے پر موجود ہوٹل پارک دیو

میں ہیں۔اور ضروری میٹنگ کے لئے جمع ہوئے ہیں۔جس کے مقصد سے ہم بخوبی آ گاہ ہیں ......ہم درندے کو بھی بخوبی جان رہے ہیں۔اب میں آپ لوگوں سے صرف ایک سوال کرتا ہوں۔کیا آپ لوگوں میں سے کوئی بھی ایسا شخص ہے جو اس درندے کا نام یہاں سے لے سکتا ہے......؟'

ماحول میں اچانک ایک دم سناٹا چھا گیا......

''نہیں......''

جواب حاضر تھا۔ہونٹ خاموش تھے......آنکھیں خوف سے اُبل آئی تھیں۔

''نہیں نہیں......''

آوازیں کانپ گئیں۔

کریم نے مسکرا کر کہا......

''میرے دوستو......ظاہر ہوا، تم اپنے خوف کی شکلوں سے واقف ہو...... اور خود ہی اسے دور کرنا نہیں چاہتے تو پھر میٹنگ بلانے کی ضرورت ہی کیا تھی——ہمت ہے تو جس درندے کے نامعلوم خوف میں گھرے ہو......ایک جست لگا کر اس کی گردن دبوچ لو......توڑ دو......'

ان کی آنکھوں میں خون اُبل آیا تھا......اچانک سب چونکے......مسز بھٹنا گر کی آواز سن کر......جو کہہ رہی تھیں......'

''کس کی گردن توڑنے کی باتیں ہو رہی ہیں بھائی؟''

بیگ جھلاتی ہوئی مسز بھٹنا گر نے اپنی خالی کرسی پر جگہ بنالی——بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولیں......

''میں بھی تو سنوں......تم کون سے ڈر اور خوف کی باتیں کر رہے ہو؟

انہوں نے چہروں کا جائزہ لیا......پھر آہستہ سے بولیں......'' آہ میرے

دوستو! تم سب غلط راستے پر جا رہے ہو...... یہ صحیح نہیں ہے—— تم بے جا خوف کی وکالت کر رہے ہو۔یہ بات غلط ہے......تم سچے دل سے سوچو......جو تمہیں آج تک سہارا دیتا آیا ہو......وہ درندہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ اور اگر وہ درندہ نہیں ہے......تو پھر دل سے یہ خوف نکال دو......کیونکہ یہ سب بے معنی ہے...... بے وجہ ہے......''

سب اچانک چونک پڑے......کریم بیگ پھٹی پھٹی نظروں سے مسز بھٹنا گر کو دیکھنے لگے......جو نظریں چراتی ہوئی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتی ہوئی کہہ رہی تھی......

''رگھوبیر......کیا میرے لئے چائے نہیں منگواؤ گے۔

''رگھوبیر نے ایک گہری سانس لی ...... پھر زبردستی کا قہقہہ بلند کرتا ہوا بولا......چائے ضرور آئے گی......کیوں نہیں آئے گی......''

کریم بیگ خاموش تھے۔

وہ جان گئے تھے......طلسم ہوشربا کی عورت کو پلٹ کر دیکھے جانے والے عمل نے انہیں پتھر بنا دیا تھا......

(۷)

مسز بھٹنا گر اپنے نئے فلیٹ میں آکر بہت خوش تھی......یہ فلیٹ صاحب نے انہیں تحفے کے طور پر دیا تھا......کچھ دنوں قبل تک یہ تین کمروں کا فلیٹ مس نیلی کا تھا ......اب مس نیلی کی موت کے بعد یہ فلیٹ مسز بھٹنا گر کا ہو گیا تھا......

صاحب نے انہیں یقین دلایا تھا......رتو! تمہارے یہ احساس بھلے بوڑھے ہو گئے ہوں......مگر تم تو ابھی پوری طرح جوان ہو......

مسز بھٹنا گر نے اچانک اتنے سالوں بعد اپنے سراپے کا جائزہ لیا تو ایسا لگا جیسے سچ مچ سب کچھ سلامت ہو۔شوہر کی اچانک موت نے وقتی طور پر جو خلا پیدا کر دیا

تھا۔ وہ خلا اچانک چھٹنے لگا تھا......شوہر کے ساتھ وہ گزارے ہوئے یادگار لمحے......وہ
نہیں بھولنے والی کھٹی میٹھی باتیں......جس کے احساس نے مسز بھٹناگر کو کئی سال تک
زندگی سے دور رکھا......باس کا دست شفقت پا کر وہ ان سارے یادگار لمحوں کی نشانیاں
اپنے بدن سے کھرچ دینا چاہتی تھی......تا کہ از سرِ نو زندگی کی بھول بھلیوں میں گم ہو
سکے۔ اس نے کہیں پڑھا تھا...... جنگ کے موقع پر ایک سپاہی کے ہاتھ کٹ گئے تھے
مگر اُس کا جوش باقی تھا—

تمہیں جینا ہے......

اور اس لئے جینا ہے کہ ابھی مادرِ وطن کے لئے بہت کچھ کرنا ہے......؍

بغیر ہاتھوں کے بھی تم ایک جنگجو سپاہی ہو۔؍

اس لئے بھول جاؤ کہ تمہارے ہاتھ نہیں ہیں......؍

تمہیں پہلے کی ہی طرح بم پھینکنے ہیں......لڑائی لڑنی ہے......؍

اس لئے سوچو مت......کہ بہادر سوچا نہیں کرتے......؍

لڑتے رہو......آخری سانس تک لڑتے رہو......؍

مسز بھٹناگر کو بھی بھولنا پڑا کہ ایک اجنبی ان کی زندگی میں ایسا بھی آیا تھا جو
کچھ خوشگوار یادیں لے کر آیا تھا۔ لیکن کب تک انسان ایسی یادیں سمیٹ کر جی سکتا ہے
......خود غرضی کے اس زرد زرد موسم میں......

وہ تو بس یہی سوچ رہی تھی......نیا فلیٹ واقعی بہت خوبصورت ہے۔ چھوٹا سا
صحن......

تین کھلتے ہوئے خوشنما کمرے......کھڑکیاں......شفاف دیواروں پر رنگین
پینٹنگس......سوفا سیٹ گدے......سب کچھ تو ہے......

مگر جانے کیوں ان سب کے باوجود ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے اس گھر کی ایک

ایک شئے میں مس نیلی زندہ ہو......وہ جب بھی کسی شئے کو ہاتھ لگانے جا رہی ہوتی،
مس نیلی سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی......اور جیسے غصے سے اس کی طرف دیکھنے لگتی......
نہیں نہیں......رتو......ان چیزوں پر تو میرا حق ہے......

مسز بھٹناگر گھبرا جاتیں—ہاتھ فوراً ٹھہر جاتے......

اس خوبصورت فلیٹ میں تنہائی کا بھی بڑا جان لیوا احساس تھا...... جہاں وہ
پہلے تھیں وہاں اس طرح کا کوئی احساس نہ تھا— آس پاس بہت سے جان پہچان کے
لوگ ......اٹھتے بیٹھتے گفتگو......مگر یہاں تو سب اجنبی تھے......اور پھر وہ جان لیوا
احساس......جیسے کوئی درندہ اُسے گھور رہا ہو......اپنی خونی لپلپاتی زبان نکالے۔

مسز بھٹناگر کا وجود برف کی طرف سے سرد ہو جاتا— پھر رفتہ رفتہ خود کو بحال
کرنے میں لگ جاتیں......اور یہ سوچ کر اطمینان کر لیتیں کہ اب ان کے اچھے دن
شروع ہو گئے ہیں......

صاحب کے قد آور ہاتھوں کا سہارا ایک خوش آئند زندگی کی شروعات ہو سکتی ہے۔

مس نیلی کی اچانک موت نے اُسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور ایسے وقت میں
صاحب نے ہی اُسے سہارا دیا تھا......

''مسز بھٹناگر—میں تمہیں ایک چھوٹا سا گھر دکھانا چاہتا ہوں...... پسند
آ جائے تو میری جانب سے تحفہ سمجھ کر قبول کر لینا......

اور اس فلیٹ میں آ کر باس کا گلا بھر آیا تھا......'میں نے زندگی میں جو چاہا
......وہ سب کچھ ملا۔ ہم افسر ہوتے ہیں......اور افسر کی ہر بات کی نوٹس لی جاتی ہے
......اس لئے ہر کام ہمیں خفیہ ڈھنگ سے کرنا ہوتا ہے......بتاؤ تو......کیسی مجبوری ہے
یہ؟......کیا افسروں کے پاس خواہش نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی......اب تم دیکھو......
ایک مس نیلی تھی اور مس نیلی بھی چلی گئی......

صاحب کا گلا بھر آیا......اس کی عجیب حالت ہوگئی۔صاحب کہیں اُس کا امتحان تو نہیں لے رہے......مگر یہ آنکھیں......یہ آنکھیں شک سے بلند ہیں......اور وہ سوچتی ہی چلی گئی......اچانک صاحب کی آواز نے اُسے چونکا دیا......جو کہہ رہے تھے۔

''مس نیلی اس کمرے کی ہر شئے میں زندہ ہے۔میں چاہتا ہوں۔تمہاری موجودگی سے اس کمرے میں نیا رنگ بکھر جائے......''

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی......

اور وہ مس نیلی کی نشانیاں ایک ایک کر کے کمرے سے کھرچنے میں لگ گئی ......مگر اندر کا ڈر ہر جگہ موجود تھا......مس نیلی تو ہر جگہ اپنی مسکراہٹ بکھیر رہی تھی...... آئینے کے آدم قد فریم میں بھی موجود تھی اور مسکرائے جا رہی تھی......

کتنی کمزور ہو تم رتو......

زندگی ایک مذاق سے زیادہ نہیں ہے......

سچ کہنا......تم درندے کے نا معلوم بڑھتے ہوئے ہاتھ سے خوفزدہ تو نہیں......؟

مسز بھٹنا گر نے ڈائری نکالی اور لکھنا شروع کیا......

'ہم سب ڈوبے ہوئے ہیں......

یہ الگ بات ہے، ہم پانی کے اُس بہاؤ کو نہیں دیکھتے......

جس میں خوف تیر رہا ہے......

ایک چھوٹی سی ڈبیہ......جو پانی پر اپلا رہی ہے......

جس میں خوف بھی ہے اور بد بو بھی......

کیا ہم یہی ہیں......؟؟'

کشمکش کے عالم میں اُن کی نظریں اب کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھیں—

باب سوم

انجم

ہمارے قلعے میں لق و دق اور بنجر میدان ہیں
یہاں روٹی اور پانی کے بھی لالے ہیں
لیکن اگر ہمارا دشمن خوشیوں کی تلاش میں آیا
تو گھبراؤ مت———
ہم اُن کی دعوت کریں گے
گولہ بارود سے۔گولیوں اور بموں سے
ہم ان کی دعوت کریں گے اور خوب کریں گے

——— کپتان کی بیٹی
الگزنڈر پشکن

(۱)

کمرے میں حبس پھیلا ہوا تھا......

یہ ہیڈ ماسٹر رگھوپتی سہائے جی کا گھر تھا......جس کے باہر والے دالان میں دونوں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ سر جھکائے...... کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے...... ان میں سے ایک انجم تھا اور دوسرا امت—— رگھوپتی سہائے جی کا لڑکا......

انجم کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں...... وہ غصہ میں نظر آ رہا تھا...... یہ کیسی آزادی ہے...... ابا جان نے ایمانداری کی قسم کھائی تو جیل کی سلاخیں دکھائی گئیں۔ سچ بولنے کے نام پر جیل بھیجا گیا...... اگر ہم اب بھی نہیں جاگے تو پھر کب جاگیں گے...... کسی کو تو جاگنا پڑے گا کہ یہ دستور بدل دو...... اس دستور سے زور کی بد بو آتی ہے...... اب ہمیں ہی دیکھو...... گریجویٹ ہونے کے باوجود بھی بیکار بیٹھے ہیں ...... ہمارے غریب باپ نوکری میں ہمیں بحال کرنے کے لئے پیسے کہاں سے لائیں گے؟...... اِن آنکھوں میں غیرت اُگتی ہے۔ امت! دوسروں کی طرح ہم آنکھیں بند کئے سب کچھ کیسے دیکھ سکتے ہیں...... بے وجہ گمتیاں توڑی جائیں گی تو ہم بولیں گے ہی...... فٹ پاتھی دکانداروں کو نکالا جائے گا تو ہم احتجاج بلند کریں گے ہی ...... غریبوں پر ظلم ہوگا تو آواز اٹھائیں گے ہی...... ابا جان اگر سچ کے نام پر جیل جائیں گے اور ان پر فسادی ہونے کا الزام لگایا جائے گا...... تو چلائیں گے ہی...... مارکس نے بھی تو یہی کہا ہے۔ آپ خاموش رہتے ہیں تو ظلم کو ہوا دیتے ہیں......''

امت جو دیر سے سن رہا تھا...... آہستہ سے بولا...... سمجھ میں نہیں آتا...... آج ملک کے اس گرگٹ موسم میں بھی لوگ سچ جیسا بھترا چاقو کیونکر استعمال کرتے ہیں......''

امت شاعر بھی تھا...... آہستہ سے بولا—— یار! گھر کے باہر وہ دیکھ! کیسی غریبی ہے...... یہ آس پاس سب ڈوم اور مہتوں کے گھر ہیں...... تو جب بول رہا تھا۔ تو ایک نظم کا آئیڈیا آ گیا...... تو بھی سن لے......

پھر اس نے خود پر بلا کی سنجیدگی طاری کی اور یوں کہنا شروع کیا......

سچ! موریوں میں رینگنے والا سب سے بدصورت کیڑا
چھبودا کی اکہری چوکی پر دم سادھے بیٹھا ہوا سچ......
انتہہ من پر چوٹ لگاتا ہوا سچ......
سچ کے نام پر جیل جاتا ہوا چھبودا......
اور جیل کی کھپڑیل آفس میں......
خاکی وردی والوں کے بوٹ کے نیچے دبا ہوا سچ
بڑی بڑی فائلوں کے بوجھ تلے مرا ہوا سچ......
اور آگے سنو گے......؟

''نہیں یار بس کرو...... مذاق نہیں......''

انجم ایک پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے بولا ...... ہمیں آج کے کارنر ڈرامہ (Corner Darma) کی فکر کرنی چاہئے ...... دوسروں کی طرح اگر ہم نے بھی موقع کھو دیا تو آنے والی نسل کو اپنی کمزوریوں کے لئے کوئی جواب نہ دے پائیں گے ...... بہت سے کام کرنے ہیں امت......''

امت سنجیدہ ہو گیا......

انجم نے پھر کہا............''امت اپنی تخلیق کو یوں بچوں کا کھیل نہ بناؤ جو ہم یوں ہی مذاق میں کہتے پھرتے ہیں...... اٹھتے ...... بیٹھتے ...... چلتے...... پھرتے—— سڑکوں پر دوستوں کے ہمراہ...... محفلوں میں...... مجلسوں میں...... مشاعروں میں......

ہوٹلوں میں ......الفاظ کو بغیر کسی اندرونی چبھن اور تکلیف کے ضائع کرنا...... یہ تضیع
اوقات ہے......آج ضرورت مقصد کی ہے......اور جب تک مقصد نہ ہوگا......ہم ان
کراہتے، دم توڑتے لوگوں کی آنکھوں میں جھانک نہیں سکتے......خیر چھوڑو......آج کا
رنر ڈرامہ کے لئے تم تیار ہونا......

''ہاں بالکل تیار ہوں'' امت نے سنجیدگی سے کہا...... یوں بھی کارنر ناٹک
کے لئے کسی ریہرسل وغیرہ کی ضرورت تھوڑے ہی پڑتی ہے......''

انجم نے گھڑی دیکھی ...... پھر کہا......آؤ چلیں۔ گوپالی چوک پر سلیم اور
مرتضیٰ انتظار کر رہے ہوں گے'' ......

امت نے پاؤں میں ہوائی چپل ڈالی......اور دونوں برآمدے سے نکل کر
باہر آگئے ......امت کھادی کے کرتے اور پائجامے میں تھا جبکہ انجم نے جینس کے
پینٹ پر کھادی کا موٹا کرتا ڈٹا رکھا تھا......مہادیوا روڈ کی اوبڑ کھابڑ سڑک پار کرتے
ہوئے دونوں نے اپنے قدم چوک کی جانب تیز کر دیئے......

راستے میں امت نے انجم سے پوچھا۔ کیا اس طرح مین چوک پر ہمارا ناٹک کرنا
اچھا ہوگا۔ جبکہ پولس ہماری عادتوں پر نظر رکھے ہوئے ہے— کہیں شک ہو گیا تو......''

''کیا ہو جائے گا......''

انجم نے سر جھٹکتے ہوئے کہا...... جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو پھر جو ہو اب تو
تماشہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے۔

اب تک یہ لوگ گاؤ گاؤں گھوم کر اس طرح کے کتنے ہی ناٹک کر چکے تھے۔
اور اس طرح کے ناٹکوں کا واحد مقصد اپنی بات کو دوسروں تک پھیلانا تھا......ظلم وستم
کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو پکڑ لینا تھا۔ یہ ناٹک عام ناٹکوں سے بالکل مختلف تھا......

ناٹک کے بارے میں کسی طرح کا کوئی اعلان نہیں کیا جاتا تھا۔ نہ کسی طرح کا اسٹیج بنایا
جاتا تھا......نہ ہی کوئی خاص پوشاک تھی جو جس ڈریس میں ہوتا، اُسی میں پہنچ جاتا......
پہلے سے ہی ناٹک کا ایک ڈھانچہ تیار کر لیا جاتا اور سڑکوں گلیوں میں اس طرح سے
پیش کیا جاتا جیسے روز ہو رہے حادثوں میں سے یہ بھی ایک حادثہ ہو......مگر اس حادثے
کے ذریعے ایک پیغام دیا جاتا کہ ظلم مت سہو......سہنا بھی ایک جرم ہے......لڑو......
زندگی کی آخری سانسوں تک ......اب تک یہ لوگ گاؤں گاؤں گھوم کر ایسے کتنے ہی
پیغام لوگوں تک پہنچا چکے تھے اور وہاں آئی ہوئی تبدیلیوں کا دھواں ان کی کامیابی کا
حاصل تھا......

جس وقت وہ لوگ گوپالی چوک پہنچے اس وقت تین بج چکا تھا۔ چوک پر کافی
رونق تھی ...... دائیں طرف چائے والوں اور کچوریاں چھانتے ہوئے کا شیوں کی
بھیڑ— چوک پر ایک بڑا سا ٹاور تھا جہاں سے راستے تین دشاؤں میں مڑ جاتے تھے
......ٹاور کے نیچے ایک کھلا کمرہ تھا جو ہمیشہ سیاسی لوگوں کا مرکز بنا رہتا......اس وقت بھی
وہاں کچھ لوگ ''ان شن'' پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی لاؤڈ سپیکر سے کوئی پیغام نشر ہو جاتا
......کچھ لوگ دھنی رمائے، چپ سادھے بیٹھے تھے......کبھی کبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر
ہنس مسکرا لیتے پھر گمبھیر ہو جاتے۔ بائیں طرف میڈیسن کی دکانیں ایک قطار سے تھیں
اور ان سے ذرا ہٹ کر سبزی اور پھل فروشوں کی ٹوکریاں سجی تھیں۔ خوانچے ایک لائن
میں بچھے تھے۔ کچھ چاٹ مسالحہ بیچنے والے چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔
عورتیں، مرد سب خرید وفروخت میں مصروف دکھائی دے رہے تھے......اور ان سے
ذرا ہٹ کر ان شن والے چبوترے کے قریب سلیم اور مرتضیٰ دونوں کھڑے تھے۔

انجم اور امت نے دور سے ہی ہاتھ ہلایا......

سلیم اور مرتضیٰ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی......پھر بغیر کسی اعلان اور تمہید

کے ڈرامہ شروع ہو گیا......سب اپنے اپنے لباس میں تھے اور جیسا کہ اس ناٹک میں ہوتا ہے......کسی نے کوئی خاص لباس نہیں پہن رکھا تھا...........

ایک آدمی بھیڑ کے بیچ سے اچانک سڑک پر دوڑ گیا...... یہ سلیم تھا اس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں...... چہرے مہرے سے دہشت جھانک رہی تھی......

پھر وہ آدمی زور زور سے چلانے لگا...... بچاؤ...... بچاؤ......ارے مار ڈالا ......کمبخت نے مار ڈالا......مار ڈالا......مار ڈالا......

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گریبان تھام رکھا تھا......آنکھیں جل رہی تھیں......

اچانک بھیڑ سے دو پبلک کے آدمی آگے بڑھے...... یہ انجم اور امت تھے ......کیا ہوا بھائی......کیا ہوا......اس قدر کیوں چلا رہے ہو۔

''وہ......''

اس آدمی نے مرتضیٰ کی طرف اشارہ کیا......مرتضیٰ، سلیم سے دُگنی کاٹھی کا تھا ......کافی موٹا تازہ جبکہ سلیم دُبلا پتلا تھا......

وہ......

سلیم کی آنکھیں بھر آئیں ...... پھر اس نے لوگوں کو متوجہ پا کر اپنی آنکھیں نچائیں......

'' بابو جی ! کیا اس ملک میں اپنا حق مانگنا جرم ہے ؟ کوئی بتائے جرم ہے؟......''

وہ مسلسل چیخے جا رہا تھا......

اس چیخ و پکار کو سن کر اچھا خاصہ مجمع اکٹھا ہو گیا......کئی آنکھیں سلیم پر مرکوز ہو گئیں ...... کچھ لوگ '' سالے روز کا چکر ہے کہہ کر آگے بڑھ گئے اور کچھ اب بھی

ہمدردی کی سخت چٹان پر بیٹھے ہوئے تھے......

''ہاں جی کوئی جرم نہیں ہے''......بھیڑ کے درمیان سے مریٹھا باندھے ہوا ایک پنجابی زور زور سے کہہ رہا تھا......کوئی جرم نہیں ہے......سب برابر ہے لوگو...... کوئی جرم نہیں ہے......

'' وہی تو میں کہتا ہوں، مائی باپ''

سلیم نے مرتضیٰ کی طرف خونی نظروں سے اشارہ کیا......اور بیک وقت کئی لوگوں کی نگاہیں مرتضیٰ کی طرف اُٹھ گئیں...... جو غصے میں مٹھیاں باندھے، مارنے کے انداز میں سلیم کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دفعتاً بھیڑ سے امت آگے گیا۔

''ٹھہر جاؤ بھائی......ٹھہر جاؤ......ایک کمزور پر ہاتھ اٹھاتے آپ کو شرم نہیں آتی...... یہ ظلم نہیں سہا جائے گا۔

ہاں نہیں سہا جائے گا۔''

انجم نے بھی آواز ملائی۔......''مگر بات کیا ہے۔

مائی باپ''— سلیم نے روتے ہوئے کہا...... یہ میرا مالک ہے......اور میں ایک مزدور—ان کے گھر میں کام لگا تھا۔ مکان بن رہا تھا جس میں کئی مزدور کام کر رہے تھے...... مجھے کام کی ضرورت تھی مائی باپ— کئی دنوں کا بھوکا تھا......ان سے کام مانگا تو انہوں نے کام دے دیا...... پر چھٹی میں جب پیسے مانگتا ہوں......تو یہ پانچ روپیہ دن بھر کی محنت کا دیتے ہیں—بتاؤ تو لوگو......''

سلیم پانچ کا پتہ لوگوں کو دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا...... بتاؤ لوگو یہی ایک کام گر کی مجبوری ہے...... بتاؤ......یہی انعام ہے......

اس پانچ کے پتے سے بھوکے مرتے بچے کی روٹی آ جائے گی......؟

ٹی بی سے مرتی پتنی کی دوا دارو آجائے گی......؟

بتاؤ......؟

اور جب ان سے حق مانگتا ہوں تو یہ مارنے کو دوڑتے ہیں......''

سلیم کی آنکھیں بھر آئی تھیں......

پھر بھیڑ کی آنکھوں میں خون اتر آیا...... بہت سے لوگ افسوس کر رہے تھے۔ دو شخص آگے بڑھے — یہ امت اور انجم تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مرتضٰی کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا......

یہ ظلم نہیں سہا جائے گا......

اس غریب کو اس کا حق دینا ہوگا......

انجم بھی زوروں سے چلایا...... ہم حق مانگتے ہیں اور اپنا حق مانگنا کسی بھی ملک کے قانون میں کوئی جرم نہیں ہے......''

پھر بیک وقت کئی آوازیں فضا میں تیر گئیں......''

ہر زور ظلم کی ٹکر میں انصاف ہمارا نعرہ ہے......''

ظلم کرنا پاپ ہے...... ظلم سہنا پاپ ہے......''

ابھی یہ نعرے لگ ہی رہے تھے کہ اچانک امت پھسپھسایا......

''انجم...... پولیس......''

''بھاگو'' — انجم ہونٹ داب کر چلایا...... جلدی بھاگو...... یہ سالے سچ کی زبان کبھی نہیں سمجھ سکتے''......

بھیڑ چھٹنے لگی...... بعض اب بھی ہونقوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے ......بعض پھکر قسم کے لوگ ہنس رہے تھے...... حالات پر تبصرہ نشر کر رہے تھے......اور جس کے جو منہ میں آ رہا تھا...... اپنی رائے دے رہا تھا...... بعض اب تک اس ہنگامے

اور بھاگ دوڑ کی وجہ سمجھنے میں لگے ہوئے تھے......

انجم، امت، سلیم، مرتضٰی وغیرہ دوڑتے ہوئے مختلف گلیوں میں گم ہو گئے......

پولیس والا ڈنڈا ہاتھ میں لئے چیخ رہا تھا......

''سالے...... نوسکھیئے سالے بھاگ گئے......

ڈنڈے کی زور پر تو بھوت بھی بھاگ جاتے ہیں......

''مگر یہ لوگ تھے کون؟''

ایک دیہاتی نے پولیس والے سے دریافت کیا......

پولیس والا بیڑی سلگاتا ہوا بولا...... نوٹنکی والے ہیں سالے...... ناٹک کرتے ہیں۔ گلی کوچے میں اچانک دوڑ پڑیں گے پھر۔ جولم، جولم چلائیں گے...... بدمعاش سالے...... لوگوں کو بہکاتے ہیں...... مل جاتے تو ساری انجری پنجری جھاڑ دیتا۔''

اچانک وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا...... ناک سکوڑی...... کچھ محسوس کیا ......پھر ناگواری کے لہجے میں بدبدایا...... بدبو...... ہونہہ...... کہاں سے آ رہی ہے بدبو......

وہ آگے بڑھا...... جہاں کچھ لوگ ان شن پر بیٹھے ہوئے تھے......

پولیس والا اب اِن لوگوں سے دریافت کر رہا تھا...... بھائی! آپ لوگوں نے کچھ کچرا وغیرہ پھیکا ہے کیا...... نہیں...... تو یہ بدبو کہاں سے آ رہی ہے...... شاید کوئی جانور مر گیا ہے...... مگر جانور کہیں نظر نہیں آ رہا ہے......

ان شن کرنے والوں میں سے ایک نیتا جیسے شخص نے ''مسکی'' چھوڑی — پھر ان شن پر بیٹھے ہوئے سارے ممبر ایک ساتھ قہقہہ مار کر ہنس پڑے...... پولیس والا جھینپا ضرور مگر اس کے باوجود بدبو تلاش کرنے میں مصروف رہا۔

(۲)

بدبو تیزی سے پھیل رہی تھی......اور سارا شہر اس کے اثر سے پاگل دکھائی دے رہا تھا......عجیب افراتفری تھی...... ہنگامہ تھا......کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا آخر یہ بدبو آ رہی کہاں سے آ رہی ہے۔ایک تو ٹھٹھا دینے والا جاڑا......دوسری سانس روک لینے والی بدبو......دونوں نے مل کر عجب حال کر دیا تھا......

وہ رات غضب کی رات تھی۔جن لوگوں نے وہ رات دیکھی ان سے پوچھئے تو بتائیں گے......اور بتائیں گے ہی نہیں بلکہ اس موقع پر ان کے چہرے کا جائزہ لیجئے۔جاڑے کا موسم تو ہر سال آتا ہے مگر لوگوں کا یہی کہنا تھا ایسی سردی زندگی میں کبھی نہیں پڑی......سات پردوں کے اندر......انگیٹھیوں۔آگ کی بڑی بڑی بھٹیوں......اور الاؤ کے باوجود دانت جیسے کڑ کڑ بول رہے تھے۔سرد لہر جیسے جسم سے طاقت چھین لے رہی تھی......صبح سے سورج کانپ رہا تھا اور بار بار بادلوں کے کہرے میں چھپا جا رہا تھا...... پھر سورج روپوش ہو گیا— گھٹا چھائی۔کئی گھنٹوں تک موسلا دھار بارش ہوئی کہ خدا کی پناہ— دکانیں بند ہو گئیں۔سردی کی تیز لہر نے یکساں طور پر سب کو مجروح کیا تھا۔سڑک ویران......دکانوں پر بت لوٹتے ہوئے— گھر کے دروازے پر سناٹا پسرا ہوا......سارے شہر میں سانپ لوٹ رہا تھا......بارش کے ہونے سے سردی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔لوگ اپنے اپنے گھروں میں سہمے اور دُبکے بیٹھے تھے...... آنکھیں پھیلی جا رہی تھیں......زندگی کی رفتار ٹھہر گئی تھی——

اور اس کی وجہ وہ تیز بدبو تھی جس کا اب تک کچھ بھی پتہ نہ چلا تھا......جیسے سرد لہر میں بدبو بھی شامل ہو—اور بدبو تیزی میں پھیلتی چلی جا رہی تھی......

''قیامت ہے...... یہ سب قیامت کے آثار ہیں......''

لوگ سوچ رہے تھے اور کانپ رہے تھے......کہ جن کے بارے میں الہامی کتابوں میں لکھا ہے...... پروجوں نے بتایا......جس کی پیشین گوئیاں کی گئیں...... اب وہ منظر سامنے تھا......

کہیں دو ایک درویش کے ہاتھ دعا میں اٹھے تھے۔

''میرے رب! یہ سردی تو برداشت کر لی جائے گی۔کہ برداشت کرتے کرتے یہ اعضا اس لائق ہو چکے ہیں......مگر خدا...... یہ تیز بدبو...... یہ تیرا عذاب برداشت سے باہر ہے......جیسے ابھی ناک پھٹ جائے گی......اور بدبو سارے جسم میں داخل ہو کر جسم کے چیتھڑے اڑا دے گی۔ہم گنہگار بندے ہیں رب العزت...... مگر باوجود اس کے...... یہ زندگی تو تیری اطاعت اور بندگی میں ہی گزری...... تیری عبادت کرتے کرتے وقت کا پتہ بھی نہ چلا......بال سفید ہو گئے......چہرے پر جھریاں پڑ گئیں......جسم سے چلنے کی طاقت ختم ہو گئی......مگر دیکھ......کیا تیری عبادت میں کچھ کمی رہ گئی ہے......''

جب بارش رک گئی تو سردی کا چوغہ موغہ پہنے کتنے ہی مرد عورتیں گھروں سے باہر نکل آئے......سب کے چہرے خوف سے لرزے ہوئے تھے......کیا یہی قیامت ہے؟ پرلئے ہے؟ ہونٹوں پر بس اسی طرح کا سوال لرز رہا تھا۔اور بدبو بڑھتی جا رہی تھی......ذہن سوچنے سمجھنے جیسی تمام باتوں سے ناکارہ ہو گیا تھا۔مندر کے گھنٹے ٹن ٹنا رہے تھے۔گوردوارے اور دیگر عبادت گاہوں میں بھی ماننے والوں کا زبردست ہجوم تھا......

ریڈیو سے بار بار یہ اعلان نشر ہو رہا تھا...... بدبو مارنے کی دوائیاں دکانوں پر بھیجی جا رہی ہیں۔آپ گھبرائیں نہیں اور نہ ہی اپنا کوئی کام بند کریں...... بدبو مارنے کی دوائیاں گھر گھر تقسیم کی جائیں گی......آپ جتنا سوچیں گے......تکلیف کا احساس

اتنا ہی زیادہ بڑھتا جائے گا......

اسکول، کالج اور دیگر اداروں کو بند کرنے کے لئے زوردار ہنگامے ہو رہے تھے......سائنس دانوں کی ٹولیاں ہر طرف پھیل گئی تھیں مگر کوئی بھی نیا انکشاف سامنے نہیں آرہا تھا......لوگ پاگل ہو رہے تھے......اور ریڈیو ہر دو چار منٹ پر یہی اعلان نشر کر رہا تھا......

افسوس ہے......

صد افسوس ہے......ہمارے آدمی بدبو کی کھوج کرتے کرتے پریشان ہو چکے ہیں......مگر کچھ بھی پتہ نہیں چل پا رہا ہے۔ہم تدابیر کرنے کے لئے کوشاں ہیں مگر جب تک کوئی سرا نظر نہ آئے تب تک کیا کیا جا سکتا ہے......''

ایسی خبریں لوگوں پر بجلی بن کر گر رہی تھیں......سب کو سامنے موت نظر آرہی تھی......خوفناک موت جو نزدیک آتی جا رہی تھی—اخبار چلا رہے تھے......رسائل چیخ رہے تھے......بڑے دماغ کہاں سو گئے ہیں......اور سچ تو یہ تھا کہ ان بڑے دماغ والوں کا بھی دماغ خراب ہو گیا تھا۔عقل پتھرا گئی تھی......

سڑک پر نئے نئے تماشہ دیکھنے کو ملتے......کچھ لوگ بڑی عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہوئے نظر آتے......کچھ گلہ پھاڑ کر چیختے......وحشیوں کی طرح شور مچاتے......پاگلوں کی طرح کمر لچکاتے......گانا گاتے......چھوٹے بڑے کا فرق ہی ختم ہو گیا تھا۔

(اپا گیٹ[1] تباہی کے متعلق جیسا سننے میں آیا تھا...... یہ تباہی اس سے کہیں زیادہ بھیانک معلوم ہو رہی تھی......سارا شہر پاگل خانہ معلوم ہو رہا تھا......لوگ عجیب عجیب حرکتیں کر رہے تھے۔)

[1] ایک مشہور فرضی قصہ۔تمام جانوروں کی ہیئت اور ساخت بدل گئی تھی......کیڑے، مکوڑے تک بڑے بڑے اور بھیانک ہو گئے تھے اور اشرف المخلوقات پر

تباہی بن کر ٹوٹ پڑے تھے......

بالآخر جیت انسانوں کی ہی ہوئی)

ایک کافی بڑا گھر ہے...... جہاں ایک شخص ریڈیو سن رہا ہے......وہ چہرے مہرے سے بھی فلاسفر دکھتا ہے......آنکھیں چمک رہی ہیں—ریڈیو سے کانپتی ہوئی آواز نشر ہوتی ہے......

''اب تک پچاس آدمی موت کی نیند سو چکے ہیں۔''

وہ شخص آہستہ سے بڑبڑایا...... پچاس آدمی — محض پچاس آدمی — حکومت صرف دلاسہ دینا چاہتی ہے......تباہی دور کرنا نہیں جانتی— پچاس تو صرف اس محلے سے مرے ہوں گے......بس پچاس......

وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسا......

سب بڑے دماغ سو چکے ہیں......

اور عزیزو! اب تو کم از کم یہ جان اور سمجھ لینا چاہئے کہ ہم سب اُس کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں ہیں......وہ جو سب سے بڑا ڈکٹیٹر ہے—ہم اس کی قید میں ہیں ......وہی آسمان اور زمین پر تصرف رکھتا ہے......اور ہم اب تک اس کو اپنے شک کے نشانے پر لئے ہوئے تھے......

پھر اچانک اُس کی سنجیدگی ختم ہو گئی......اُس نے ہنسنا چاہا مگر ہنس نہ سکا......

اُس نے عجب سا منہ بنایا......

شاید...... شاید ہمارے قہقہے بھی بدبو کی لہروں میں پھنس چکے ہیں۔

اُف......کمرے میں بدبو کا تیز ریلا داخل ہو گیا۔کہیں عافیت نہیں ہے......کہاں جایا جائے......صرف ایک راستہ رہ گیا ہے......

موت......

واحد اور اٹل راستہ......موت

ایک بھیانک سچ......

اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں......اندر ایک انقلاب نے انگڑائی لی......تف ہے ایسی حکومت پر جو اپنے عوام کو بدبو سے بچانے میں ناکام ہو......اور کوئی حفاظتی اقدام نہ اٹھائے...... بدبو بڑھتی جا رہی ہے......اس لئے......

اب اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ رومال کو موڑ کر اس نے ایک گولہ سا بنا دیا......کھادی کا کرتا ڈٹایا— پائجامہ پہنا......اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی شکل دیکھی......

ہاں......اب ٹھیک ہے......میں بدبو سے پورے طور پر بچ گیا ہوں......کسی نہ کسی کو تو ایسا ہونا ہی چاہئے جو بیچارے عوام کی ہمدردی کھینچ سکے......موقع بھی غنیمت ہے......

وہ پھر قہقہہ مار کر ہنسا......جیسے کہہ رہا ہو......

میرے دوستو! تم کتنے بیوقوف ہو...... بدبو کا سامنا کرنے کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہئے۔ موقع سے فائدہ اٹھانا ہی عقلمندوں کی سرشت رہی ہے......مگر شاید ابھی میں نامکمل ہوں......آئینے میں کسی چیز کی کمی رہ گئی ہے۔

ایک شیشے کا بغیر پاور کا فریم...... جو بہت سی چبھتی آنکھوں سے خود کو بچا لیتا ہے۔ ایک پتلی سی لاٹھی......جس سے آدمی خاصہ رعوبیلا ہو جاتا ہے اور جو حفاظتی اقدام میں بھی مدد دیتی ہے......

پھر چشمہ آنکھوں پر لگایا...... لاٹھی تھامی...... اور کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے دوستوں کے شامل تھا...... چہرے پر سنجیدگی والی بارش کے چند قطرے تھے...... آنکھیں گہرے اضطراب میں ڈوبی ہوئی تھیں......

حیرت ہے کہ تم سوئے پڑے ہو......اس پھیلتی ہوئی تیز بدبو کے باوجود......

کل ہم اسی واسطے ہار گئے تھے کہ تمہیں نیند پیاری تھی......

کیا......نہیں......سچ کہنا؟

مگر آج جاگنا بہت ضروری ہے......خود جاگنا ہے......عوام کو جگانا ہے......

کہ ایسی حکومت جو لولھی ہے......لنگڑی ہے...... جو بدبو سے بچانے کی ایک تدبیر بھی نہ کر پائے......ایسی ناکارہ حکومت نہیں چاہئے......میں نے کل بھی انصاف اور حقوق دلانے کا نعرہ بلند کیا تھا۔ ہم آج بھی اس وعدے پر قائم ہیں......آج پھر سے وقت آ گیا ہے...... یہ لڑائی زبردست ہے ہمیں مورچہ لینا ہے...... جیت ہماری ہوگی...... دیکھ لینا جیت ہماری ہوگی''

اور شہر جب سرد کہروں سے لپٹا ہوا تھا......آسمان سے بدبو کی بارش تیز تھی۔ سڑکوں پر سراسیمہ لوگوں کی بھیڑ ہر لمحہ ایک نئی قیامت کی منتظر تھی۔ بعض رو رہے تھے...... چلا رہے تھے۔ بچے ناک بند کئے بلبلا رہے تھے۔ عورتیں سخت اضطراب میں تھیں...... بدبو مارنے والی دوائیاں ہر گلی کوچے، سڑکوں پر چھینٹی جا رہی تھیں......مگر اس کے باوجود وہی ہنگامہ برپا تھا......

اور شہر جب بدبو کے ڈر سے شاہراہ پر گونگا کھڑا تھا......تو وہ عالم شخص اپنے چند دوستوں کے ہمراہ لوگوں کے ایک بڑے جتھے سے خطاب کر رہا تھا......

''میرے دوستو......میرے بھائیو......وقت آ چلا ہے......تم ایک لمبی نیند سوتے رہے...... اُس سے انجان ہو کر کہ کوئی تمہارے ارد گرد بدبو کے تخم بوتا رہا ہے......تم سوتے رہے اور وہ اپنا کام ختم کر کے روپوش ہو گیا......تم ایک طویل نیند کے بعد جاگے......اور جب تباہی تمہارے گھروں پر دستک دے رہی تھی......تم نے صاف محسوس کیا کہ حکومت کتنی کمزور ہو گئی ہے......

میں......کوئی نیا وعدہ......کوئی نیا فرمان لے کر تمہارے پاس نہیں آیا— بلکہ
یہ کہنے آیا ہوں کہ ہم سب مل کر محبت کی ایک موٹی رسی بن سکتے ہیں......ہم سب مل کر
اس بدبو سے جنگ کر سکتے ہیں......

اور ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ حکومت اس معاملے میں کتنی ناکارہ رہی—
باوجود لاکھ کوششوں کے— کچھ بھی نہ کر سکی— جس کا نتیجہ ہے کہ ہم اس بدبودار فضا
میں سانس لے رہے ہیں...... ہر سانس کے ساتھ زہر پی رہے ہیں...... ہزاروں بچے
روز بدبو کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں......عورتیں، مرد، بچے سب اس ناگہانی آفت کی زد
میں آ کر موت سے قریب ہوئے جا رہے ہیں......

ہم پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ حکومت کیا کر رہی ہے؟

اب تک بدبو سے بچنے کا کیا حل تلاش کیا گیا؟

اب نعرے بازی سے کام نہیں چلے گا جو وہ اب تک کرتی رہی......

صرف بہلاوا......جو شروع سے ہمارا مقدر رہا......

تو اب کہہ دو......کہ اس بدبو بھری فضا میں ہم اور سانس نہیں لے سکتے......

ہم اور چپ نہیں بیٹھ سکتے......

ایسی حکومت نہیں چاہئے......جو ہماری حفاظت نہ کر سکے۔

جو ہمارے حقوق کو بحال کرنے میں ناکارہ ثابت ہو......جو بالکل گونگی ہو......

اور اب بھی وقت ہے میرے دوستو...... ورنہ کل تک تو بہت دیر ہو چکی
ہوگی......ہمیں حکومت سے صاف صاف کہہ دینا ہے۔اس کی کمزوریاں نہیں چاہئیں
ہمیں......ہم اپنے بچوں، عزیزوں، دوستوں کو اور زیادہ مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے
......ہمارے کارخانے ٹھپ ہیں......فیکٹریاں بند ہیں......اسکول کالجوں میں تالے
لگے ہیں...... ہاسپٹل مریضوں سے بھرے پڑے ہیں......حفاظتی کیمپ لگانے کے

باوجود نئے مریضوں کے لئے مسئلہ پیدا ہو چکا ہے......کہ اب ان کو کہاں لے جایا
جائے— روز ہزاروں لوگ ان کیمپوں میں بھرتی ہو رہے ہیں......ڈاکٹر فیل ہیں—
بڑے دماغ سو گئے ہیں......کوئی کچھ نہیں کر پا رہا ہے۔

ہم سب ایک موت جھیل رہے ہیں......

یہ قیامت...... یہ پر لئے حکومت کی دین ہے۔

جس نے شروع سے ہی کوئی قدم نہ اٹھایا......اگر حکومت شروع سے ہی یہ
بدبو محسوس کر لیتی تو آج یہ برا دن دیکھنا ہماری قسمت میں نہ لکھا ہوتا......اور......سب
سے بڑی بات یہ ہے......''

اتنا کہہ کر عالم شخص ٹھہرا......لوگوں کا جائزہ لیا...... پھر آنکھیں نچاتے
ہوئے بولا......سرکاری ادارے آج بھی کھلے ہوئے ہیں— آفسوں میں آج بھی
کام ہو رہا ہے......حکومت نے یہ اعلان کیا ہے کہ لاکھوں کا نقصان ہو رہا ہے......اس
لئے آفسوں میں پہنچنا ضروری ہے......اس آشوب وقت میں بھی حکومت کو اپنے
نقصان کی پڑی ہے۔اب آپ بتایئے ایسے وقت میں ایک باپ......ایک بھائی کیسے
آفس جا سکتا ہے......حکومت کا یہ قدم صاف ظاہر کر رہا ہے کہ حکومت ہمارے معاملے
میں دلچسپی نہیں لے رہی ہے......

ہمیں صاف لفظوں میں حکومت دشمنی کا باضابطہ طور پر اعلان کر دینا چاہئے......

ورنہ کل تک بہت دیر ہو چکی ہوگی......آیئے میرے ساتھ آپ بھی نعرہ لگایئے۔

حکومت......مردہ باد......

سرکاری ادارے بند کرو......ہم سے نہ کھلواڑ کرو۔

جان بچاؤ مدد کرو......ورنہ گدی چھوڑ دو......

انقلاب زندہ باد......

اور پھر تیز نعرے آسمان میں گونج گئے......

اور جس وقت یہ نعرے آسمان چھو رہے تھے......اسوقت ایسے لوگوں کا بھی گروہ تھا جو آپس میں تبصرہ کر رہا تھا...... یہ لیپر وسی کیمپ کے لوگ تھے...... جو زندگی سے تھک چکے تھے......عاجز آ چکے تھے...... یہ قوم اس عذاب سے خوش تھی...... کہ اب موت نزدیک ہے......اور موت ان کی بدتر زندگی کا خاتمہ کر دے گی......

''ہمیں موت چاہیئے......'' ایک سفید بیمار چہرے والے نوجوان نے آہستہ سے کہا...... اور سڑے ہوئے ہونٹ کے 'پھا پھڑ' سے ٹیڑھے نکلے دانتوں کی قطار سامنے آ گئی......موت چاہیئے......

ایک کمسن لڑکی نے بھی اس کی آواز میں اپنی آواز شامل کی......ایسی زندگی سے موت بہتر......

ایک فقیر آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا...... ''کیئسن بتوا ہے...... پیٹ بھوکل ہے۔ کونو بھیک نہ دے وے۔ کے کے سامنے ہاتھ پساری جائی۔ سبھے بدبو سونگھے میں لگت ہیں......''

دوسرا آہستہ سے ہنسا......تم نے بدبو محسوس کی...... ہمیں تو کچھ بھی نہیں محسوس ہوتا......بس تھوڑی سی ہے......اس سے کا نقصان ہے......'

اور پہلا بھی بے مقصد قہقہہ لگانے لگا...... ''پتہ نہیں۔ کیسن بدبو ہے ہمار تو کوچھو سمجھ میں نئی کھے آوت......؟

سبزی فروشوں اور پھل والوں کے خوانچے بھی اداس تھے...... شاہراہ پر ویرانی سمٹ آئی تھی......لوگ سجدے میں پڑے تھے اور اپنی گمشدہ دعائیں تلاش کر رہے تھے...... بڑی بڑی دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے......اس آفت ناگہانی میں بیکار چیزیں کون خریدتا......سب موت سے خوف زدہ تھے کہ کون جانے کب بدبو کا

ایک تیز ریلا آئے اور سب کو بہا کر لے جائے......

ریڈیو سے بار بار اعلانات نشر ہو رہے تھے......

بدبو کی تیز لہر نے ساری فصل جلا ڈالی ہے......

زبردست قحط سالی کا امکان......

چہروں کے رنگ اڑ گئے تھے...... ہر پل ایک نئی آفت...... ہر پل ایک نئی خبر...... پہلے ٹھنڈی لہر......پھر بدبو......اور اب قحط......جانے خدا کو کیا منظور ہے......

چھوٹے موٹے اخبارات بند ہو چکے تھے...... جو تھوڑے بہت اخبارات نکل رہے تھے......ان میں اس طرح کے مضمون کو کافی اہمیت دی جا رہی تھی جس میں خود اعتمادی کو بحال کرنے کی صلاح دی جا رہی تھی۔

کیا سارے دفاتر اسی طرح بند رہیں گے؟

اسکول، کالجس اس طرح بند رہیں گے؟

آدمی کب تک بھوکے رہ سکتا ہے؟

لوگ کب تک بیکار بیٹھے رہ سکتے ہیں......

بدبو ضرور بڑھ رہی ہے......مگر ہمیں بدبو سہنے کی عادت ڈال لینی چاہیئے......

ہم اشرف المخلوقات ہیں...... ہماری ڈکشنری میں خوف اور ناممکن جیسا مہمل لفظ نہیں ہے......ہمیں بھروسہ کرنا چاہیئے......اور پھر سے اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو جانا چاہیئے......

یہ صحیح ہے کہ یہ بدبو پلیگ سے بھی خطرناک چیز ہے......جو پھیلتی جا رہی ہے ......مگر سوچ کا موذی کیڑا ابھی تو ہمیں ختم کر دے رہا ہے—اس لئے اس طرح کے خیالات دل سے نکال دینا چاہیئے......حکومت حفاظتی تدبیر کر رہی ہے......''

اخباروں میں اس طرح کے مضمون بھرے پڑے تھے......اور کسی حد تک

اس طرح کے مضامین نے اپنا رنگ بھی دکھایا تھا......کچھ لوگوں کے چہروں پر اطمینان تو نہ تھا مگر خوف کا اثر کم ہو گیا تھا۔

عوام کے نام حکومت کی اپیل بھی اپنا رنگ لائی ......جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ سرکاری غیر سرکاری ادارے جو کسی وجہ سے بند تھے اب کھول دیئے گئے ہیں......اسکول اور کالج کو بھی کھلنے کا حکم دیا جاتا ہے......آپ کا فرض ہوتا ہے کہ آپ حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔حکومت پر بوجھ نہ بنیں۔

ان اعلانات میں پرزور اپیل کی گئی تھی۔کہ بچوں کو اسکول ضرور بھیجا جائے ......دفتروں میں ضرور حاضر ہوا جائے......نوجوان ہمیشہ کی طرح کالج جائیں......لوگ بیکار گھر نہ پڑے رہیں بلکہ دوبارہ اپنے اپنے کام میں مشغول ہو جائیں...... ورنہ دیگر صورت میں حکومت دشمنی کے نام پر ان کے خلاف سخت کارروائی بھی کی جاسکتی ہے۔''

یہ اپیل نہیں تھی۔ایٹم بم تھا......جس کی چنگاری سلگی تو چہرے خوف سے لہولہو ہو گئے—— مگر کچھ لوگ اطمینان سے تھے کہ شاید اس سے، بدبو سے بچنے کا سامان نکل جائے۔

اور پھر وہی ہوا......

دوسرے دن سے اسکول کالج کھل گئے۔شہر میں زندگی لوٹ آئی—— بچے کالج اسکول جانے لگے......دکانیں آباد ہو گئیں۔سڑکیں پھر سے پر رونق ہو گئیں۔ سبزیوں کے دام آسمان پر پہنچ گئے تھے......پھل بھی کافی مہنگے ہو گئے تھے......غلہ سونے کے بھاؤ ہو گیا تھا......سرکاری دفاتر میں رونق لوٹ آئی تھی ......لوگ باگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے تھے۔

ہاں اتنا ضرور تھا کہ کام کے دوران ان کے ناک رومال یا کسی موٹے کپڑے سے بند ہوتے......

اب سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا۔

کبھی کبھی ریڈیو سے یہ اطلاع موصول ہو جاتی کہ فلاں جگہ سے بدبو کا ایک تیز ریلا آپ کی جانب بڑھ رہا ہے......حکومت حفاظتی تدبیر کے لئے کوشاں ہیں...... آپ گھبرائیں نہیں ......اپنے اپنے گھروں میں پابندی سے ہر ایک گھنٹے بعد بدبو مارنے کی دوائیاں ڈالتے رہیئے......

ہاسپٹل اب بھی بھر رہے تھے مگر بہت سارے حفاظتی اقدام سے اب مرنے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز کمی آئی تھی...... چہرے پھر سے بحال ہو گئے تھے۔

مگر اب صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ لوگ بدبو کے عادی ہو چکے ہیں......اور بدبو——لوگوں کے اندر سرایت کر گئی ہے......

(۳)

''تمہاری باتوں میں بدبو بھری ہے کیا تم اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتے۔''

مسز بھٹناگر نے گھر کا باریکی سے جائزہ لیا......کھڑکیوں کے پردے بدلے اور گھر سجانے میں لگ گئیں ...... بدبو بدستور قائم تھی ۔مسٹر بھٹناگر نے ناک سکوڑی......کم بخت یہ بدبو جانے کیسے دور ہوگی؟ سب چیز تو قرینے سے سج گئی...... مسئلہ صرف بدبو کا رہ گیا ہے...... پیکٹ سے دوائیاں نکال کر کونے کونے میں چھیٹنے کے بعد وہ تھکی ہاری بستر پر لیٹ گئی......

آج اتوار کا روز تھا اور آج صاحب نے آفس کے سارے لوگوں کو اس نئے فلیٹ میں دعوت پر بلایا تھا......

دعوت دیتے ہوئے صاحب کا چہرہ خوب چمک رہا تھا......ہم بدبو کا سامنا تو

نہیں کر سکے مگر عادی ہو گئے ہیں......اور اب ایسا لگتا ہے جیسے موت...... جو ہمارے
بالکل قریب آ گئی تھی......اب ہماری سہنے کی قوت سے ایک بار پھر دور چلی گئی ہے۔
بدبو کی صورت میں ایک عذاب نازل ہوا تھا......اور ہم نے دکھا دیا......کہ ہمارے
قدم اس عذابی موسم میں بھی نہیں ڈگمگائے......آفس کھلی رہی...... بدبو کا سامنا کرنے
کے باوجود بھی آپ آتے رہے......اپنا کام بخوبی انجام دیتے رہے۔اور مسز بھٹنا گر
میری دوستی کا فریضہ بخوبی انجام دیتی رہی......

صاحب مسکرائے تو دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی مسکرا پڑے—اور مسز
بھٹنا گر نے شرم سے نظریں نیچی کر لیں۔ایک ہلکی سی دھیمی آواز جو شاید رتھ اور سموئل
میں سے کسی کی تھی......سنائی پڑی......''شرما کر تو مسز بھٹنا گر پچیس سال سے بھی کم کی
دکھائی دیتی ہیں۔

اور اس آواز سے اس کے اندر ایک عجیب سی خوشی بھر گئی...... وہ اب بھی
جوان ہیں......صرف صاحب کی نظروں میں بھی نہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی اُسے ایسا
ہی سمجھتے ہیں......اور غلط کیا سمجھتے ہیں...... بڑھاپا تو اُسے چھو کر بھی نہیں آیا ہے۔

مسز بھٹنا گر نے مسکرا کر گھڑی کی جانب نظر ڈالی۔اب وقت ہو گیا ہے......
اب وہ لوگ آتے ہی ہوں گے......

اور کچھ ہی دیر بعد مہمانوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

پہلے صاحب آئے کہ میزبان وہی تھے۔وہ صاحب کے قدموں میں بالکل
نئی نویلی دلہن کی طرح بچھ گئی......صاحب نے گھر کی سجاوٹ کو پسند کیا۔پھر اس کو دیکھ
کر مسکرائے۔تم نے تو کافی انتظام کر ڈالا...... میں نے تو اس طرح کے انتظام کے
متعلق سوچا تک نہ تھا۔''

ٹھہر کر جیسے وہ الفاظ جوڑ رہے تھے......آج کا فرض تم نے ایک ہاؤس

وائف سے بھی بڑھ کر پورا کیا ہے...... میں نہیں جانتا تھا کہ تمہارے ہاتھوں میں اتنا
ہنر ہے۔

اس نے کافی تیار کی اور بڑے پیار سے صاحب کو پیش کی......''تم نے خود
کے لئے نہیں بنائی؟

صاحب نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا......

''بس خواہش نہیں ہوئی۔''

وہ آہستہ سے بولی...... صاحب نے کافی کا کپ تھام لیا...... انگلیاں
نچاتے رہے...... پھر ایک ہی نشست میں ختم کر کے ٹیبل پر رکھ دیا۔اور اس کی نئی
بنارسی جارجٹ کی ساڑی کو بغور دیکھنے لگے۔پھر اٹھ کر اس کے قریب آ گئے......اتنے
قریب کہ اس نے باریک نظروں سے صاحب کا مطالعہ کیا...... ہاتھوں پر بال......
سینے پر بال......اچانک اسے بڑا عجیب محسوس ہوا...... یہ بال اچانک بڑے ہوتے
ہوئے محسوس ہوئے...... پھر لگا جیسے صاحب کا جسم سمٹنے لگا ہو......اور پھر جسم سمٹ کر
......اور بال بڑے ہو کر بھالو کی ہئیت میں تبدیل ہو گئے......اچانک وہ چونک گئی......
چونک ہی نہیں گئی بلکہ خوف سے کانپ بھی گئی......ایک بھالو اس کے چاروں طرف
رقص کر رہا ہو......اپنا نوکیلا پنجہ اس کے گوشت میں گاڑ رہا ہو......سارے جسم میں
عجیب سی جلن کا احساس ہو رہا تھا...... پتلیاں خوف سے سکڑ گئی تھیں......وہ چیخ مار کر
الگ ہو جاتی......مگر......وہ تو اچھا ہوا کہ صاحب خود ہی ہٹ گئے......اور آہستہ سے
بڑبڑائے......رتو......تم نے محسوس کیا......اُف کتنی تیز بدبو ہے......تم نے دوائیاں
ڈالیں؟''

اور جب اُس کا جواب ہاں میں پایا تو خود ہی قہقہہ مار کر ہنس پڑے—
دوائیاں ڈالو نہ ڈالو......بات برابر ہی ہے......بدبو تو بہر حال قائم رہے گی۔

اب اس کے چہرے پر سکون دوبارہ لوٹ آیا تھا......

صاحب کہہ رہے تھے......رتو! دنیا میں اب صرف ایک ہی بیماری رہ گئی ہے ......بدبو......شاید دنیا میں پھیلی ہوئی ساری بیماریاں مل کر ایک نام بن گئیں......اور جب ایک بیماری کا صحیح طور پر علاج نہ ہو سکے تو اس بیماری کا کیونکر ممکن ہے...... یہ صحیح ہے کہ ہم نے سہنا سیکھ لیا......خود سے ایک سمجھوتہ کر لیا......مگر بدبو تو آخر بدبو ہی ہے اور ایسی تیز کہ سانس ڈوب جائے...... ہر جگہ سائے کی طرح ہمارا پیچھا کرتی ہے...... لیٹرین جاؤ...... باتھ روم جاؤ...... بیڈروم میں......نہ آدمی کتاب پڑھ سکتا ہے......نہ آفس کی فائلوں کے متعلق سوچ سکتا ہے......اور نہ ہی......

صاحب ہنسے......ٹھیک سے پیار ہی کر سکتا ہے......

وہ شرما گئی......اور صاحب ہنستے چلے گئے......

شام ہوتے ہی اسٹاف کے سارے لوگ پہنچ چکے تھے......مسز بھٹناگر نے بغیر کسی کی مدد کے بڑا اچھا انتظام کر ڈالا تھا......صاحب کے بہت سے جاننے والے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آئے تھے......صاحب کے بہت سے دوست نوجوان لڑکے لڑکیاں بھی اس دعوت میں شامل تھے......غرض یہ ایک تفریحی پارٹی تھی......

ہلکی ہلکی شام بڑی خوشنما لگ رہی تھی...... بدبو اب بھی پھیلی ہوئی تھی...... فلیٹ میں قمقمے روشن ہو چکے تھے۔

صاحب نے ایک پیگ چڑھایا اور بولے......دعوت ہماری زندگی کے لئے ضروری ہے......دعوت آپس میں میل جول اور دوستی پیدا کرنے کا ایک خاص ہتھیار ہے ......آج اس مبارک موقع پر ہم سب ساتھ ہیں......اسی خوشی میں چیئرس......

پھر ایک بے معنی زوردار قہقہہ کمرے میں پھیل گیا......کئی نقرئی قہقہے بھی بدبو کی لہر میں ڈوب گئے......

رتھ نے شراب کا گلاس تھامتے ہوئے کہا......شراب پیتے ہوئے ہم بدبو کے احساس سے بہت دور چلے جاتے ہیں...... کیونکہ یہ بدبو ہمارے جسم کی بدبو سے بہت کم ہے......اور جسم نے اتنی بدبو پی لی ہے کہ اب کوئی شراب نشہ پیدا نہیں کرتی۔''

شراب سارے غم پاٹ دیتی ہے۔

ورما اتنے آہستہ سے بولا جیسے کوئی گناہ کر رہا ہو......اس کی آواز کی کمزوری ہر شخص نے محسوس کی مگر کوئی کچھ نہیں بولا...... اور کون بولتا...... کہ سب اپنی اپنی کمزوریوں سے واقف تھے......اور جیسے خود پر یہ یقین مسلط کرنا چاہتے تھے کہ بدبو اُن کے درمیان نہیں ہے......مگر بدبو لہر سے کوئی کیسے بچ سکتا تھا......؟

محفل کا ہر فرد جھوم رہا تھا......عجیب عجیب حرکتیں کر رہا تھا......قہقہوں پر قہقہے لگ رہے تھے......اور ان سے الگ مسز بھٹناگر جانے کیوں بہت عجیب سا محسوس کر رہی تھیں......ایک ایسا احساس جو ایک طویل مدت بعد ان کے تھل تھل گوشت میں سرایت کر گیا تھا......

تم نیلام گھر میں پڑا ہوا ایک گوشت ہو......

یہ تمہارے گاہک......

دیکھو......غور سے دیکھو......تمہاری بولی لگنی شروع ہو گئی ہے۔

یہ صاحب کے لوگ ہیں......ان کا بھی برابر کا حق ہے......

مگر پاگل لڑکی......نہیں پاگل عورت......نہیں پاگل بوڑھی—ذرا خیال تو کرو...... کہ تمہارے اندر کوئی آگ نہیں رہ گئی ہے......پھر بھی تمہیں اس نیلام گھر میں نچایا جا رہا ہے......فروخت کیا جا رہا ہے۔

یہ گوشت اب سرد ہیں......کوئی مانگ نہیں رہ گئی ہے ان کی—خود کو نیلام گھر کی اس بولی سے بچاؤ......

یہ تم جیسی پاگل عورتوں کی زندگی کا ایک واہیات ڈرامہ ہے...... اسے ختم کرو......''

اور جب اندر سے یہ آواز آئی تو مسز بھٹنا گر اندر ہی اندر سہم گئیں...... چہرہ خشک ہو گیا۔

اچانک صاحب کی آواز آئی جو کہہ رہے تھے...... یہ کریم بیگ کیوں نہیں آیا......''

''کریم بیگ مذہبی آدمی ہو گیا ہے''— جواب میں کہا گیا......

''مذہبی آدمی؟''...... صاحب نشے میں ہنسے...... پھر چہرے پر غم سمٹ آیا......آؤ......ایک دوسرا جام پئیں......کریم بیگ کے لئے......اس کی خوشی کی موت کے لئے......

سب ایک دم سے خاموش ہو گئے......جیسے واقعی گہرا صدمہ ہوا ہو......

''کریم بیگ واقعی مر گیا ہے۔'' رتھ کہہ رہا تھا...... جو شخص اپنی خوشی چھوڑ دے......قہقہوں کی دنیا سے نکل کر تنہائی کی دنیا میں چلا جائے کیا ہم اس شخص کو زندہ کہیں گے...... مذہب ڈر اور خوف کی ایک بھدی شکل ہے...... جو خود ہم نے بنائی ہے۔ الجھاوے کے راستے سے بچنے کے لئے...... پہلے ایک خدا تھا پھر یہ خیال متعدد خداؤں میں کھو گیا......اور ایسا اس لئے کیا گیا کہ ان ناسمجھوں کا خیال تھا کہ ایسا کر کے ہم اپنی زندگی کو ایک صحیح سمت دے رہے ہیں......زندگی جینے کا ایک سیدھا سا راستہ نکل جائے گا......اور اس طرح سب پابندی کے غلام ہو گئے۔

مسز بھٹنا گر اس لمبی چوڑی گفتگو سے اوب گئی تھیں۔ اسی لئے بولیں......

سموئل...... یہ فلسفہ کسی اور دن کے لئے رہنے دو......ایسا نہ ہو کہ یہ دعوت بے مزہ ہو کر رہ جائے......''

رگھو بیر اب بھی چپ تھا......آنکھیں سوچ میں گم تھیں......صاحب کی نظریں جیسے ہی رگھو بیر پر گئیں، انہوں نے ورما کو ٹہوکا دیا...... یہ رگھو بیر اتنا چپ کیوں ہے۔

ورما کی معصومیت پر کئی لوگ قہقہہ مار کر ہنس پڑے......

صاحب بھی بولے۔'' بھئی رگھو بیر جب اتنے لوگوں کی خواہش ہے تو کچھ کہہ ہی ڈالو......

رگھو بیر نے اپنی خاموش پلکیں اٹھائیں...... ماحول کا جائزہ لیا۔ پھر نظریں نیچی کر لیں......اور دھیمی آواز میں بولا...... میں کوئی پیدائشی شاعر تو نہیں......آج پھیلی ہوئی اس تیز بدبو میں جو کچھ میں محسوس کر سکا، وہ تھوڑے بہت لفظوں کے جوڑ توڑ کے ساتھ حاضر ہے......

وہ ٹھہرا اور اپنی آواز بلند کی......

''بدبو کے کانٹے دار جنگل میں۔

بے رحمی سے پکڑے ہوئے موت لے گئی ہے......

شہر کو لوٹنے والے راستے پر۔

تاریکی کا دیو پڑا کراہ رہا ہے......

میرے محبوب......

تیرے ساتھ کی گئی بے وفائی کا نتیجہ ہے موت۔

تیرے ساتھ برتی گئی بے مروتی کا نتیجہ ہے موت

آہ! تو کس قدر قریب رہا۔

اور میں تجھ سے کس قدر دور

میرے محبوب

نئے شہر میں بوئی گئی فصل اب تیار ہو چکی ہے۔

اوران میں پھلوں کی جگہ بدبو اگ آئی ہے۔

آج پھر تیری ضرورت ہے۔

مگر یہ شہر تیرے بغیر تاریکی میں گم ہو چکا ہے‘‘

رگھو بیر کی آواز خاموش ہوئی تو ایک سناٹا سا چھا گیا۔ کچھ تالیاں بجنے کی آوازیں سنائی پڑیں۔ ان میں صاحب بھی تھے۔ جو مسکراتی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تے۔

’’رگھو بیر! تمہاری سوچ تو عمدہ قسم کی ہے۔ مگر ایک چیز سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ محبوب کون ہے۔ یہ محبوب مذہب بھی ہو سکتا ہے؟‘

اس سے پہلے کہ رگھو بیر کچھ جواب دیتا ایک نوجوان زوروں سے بڑبڑایا—

’’سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ تم لوگ کلاسیکل قسم کی چیزیں ہی ہمیشہ کیوں لکھتے ہو...... رومانٹک قسم کی باتیں تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتیں......‘‘

اگر اجازت ہو تو میں بھی کچھ بولوں۔‘‘ رتھ نے آہستہ سے کہا۔

صاحب پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ہاں رتھ — صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے۔‘‘

رتھ نے گلہ کھکھارا۔ محفل کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہنے لگا— رگھو بیر کی اس نظم سے جو خیال پیدا ہوتا ہے میں سرے سے ہی اس خیال کی مخالفت کرتا ہوں۔ میں نہیں جانتا...... یہ ادیب یہ شاعر۔ اپنی تخلیقات میں اچھے آدمی کی مثالیں ڈھونڈھا کرتے ہیں وہ اچھا آدمی انہیں کہاں ملے گا— مکمل آزادی یہ ہے بھی یا نہیں ...... میرے خیال میں ہم سب مکمل ہیں ...... گناہ آدمی کی سرشت میں ہے اس سے بغاوت یا انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں سے میں پوچھنا چاہتا ہوں وہ اپنے عقیدے ہم پر کیوں تھوپنا چاہتے ہیں۔ ہماری خوشیاں کیوں خریدنا چاہتے ہیں۔

ہم ہر حال میں خوش ہیں۔ میرا بس چلے تو ایسے لوگوں کو بدبو پھیلانے کے جرم میں قید خانے میں ڈال دوں............ اور چیخ چیخ کر زمانے کو یہ بتا دوں...... کہ اے لوگو......

اے لوگو...... ہم سچ کے پجاری ہیں......

تمہاری اُلجھی ہوئی باتیں ہمیں بے بنیاد اور بہکی بہکی لگتی ہیں۔

ہمیں صرف سچ چاہئے سچ جو کھلا ہے۔ ہمارا فطری لباس ہے۔ ہماری وہ خواہشیں سچ ہیں جن پر ہمارا اختیار نہیں ہے......

ماحول رنگین ہو گیا تھا۔

فلیٹ میں دو شخص چپ تھے...... رگھو بیر اور مسز بھٹناگر— قہقہے جوان تھے ...... کہ اچانک سب چونک پڑے......

’’اف کتنی تیز بدبو ہے۔

’’تم نے محسوس کیا......‘‘

’’بدبو بڑھتی ہی جا رہی ہے‘‘

کہیں سے بدبو کا کوئی تیز جھونکا آیا ہے‘‘۔

اچانک ہنستے ہوئے چہروں پر گھبراہٹ سمٹ آئی......

بدبو کمرے میں پھیلتی جا رہی تھی— کمرے کی ایک ایک شئے سے تیز بدبو اٹھ رہی تھی...... رگھو بیر کی آنکھوں میں جیسے اندھیرا چھاتا جا رہا تھا......

یہ عذاب ہے......

ہاں یہ عذاب ہے......

وہ مختلف صورتوں میں اپنے عذاب نازل کیا کرتا ہے......

یہ پر لئے نہیں ہے...... بلکہ ہمارے گناہوں کا حاصل ہے......

’’اب کیا ہوگا‘‘ سب کے چہروں پر دہشت پھیل گئی تھی......

صاحب کانپتے ہونٹوں سے گویا ہوئے ......سب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ جاؤ...... بدبو سے بچنے کا صرف ایک راستہ ہے۔ہم اپنے اعتماد کو جانے نہ دیں...... حوصلہ نہ چھوڑیں......''

لوگ ڈر کے مارے کرسیوں پر بیٹھ گئے......

صاحب نے آگے بڑھ کر ریڈیو آن کر دیا......

ریڈیو سے اعلان ہو رہا تھا......'' عوام کو آگاہ کیا جاتا ہے— ہم پھر مصیبتوں اور خطرے میں گھر گئے ہیں۔نامعلوم جگہ سے بدبو کا ایک تیز ریلا ملک میں داخل ہو گیا ہے......ہم اپنی کوششوں میں مصروف ہیں۔آپ بھی ضروری کارروائیاں اختیار کیجئے۔سڑی گلی چیزیں ہٹا لیجئے۔بدبو مارنے کی دوائیاں ہر جگہ ڈال دیجئے...... اور ہمت سے کام لیجئے— بھگوان نے چاہا تو کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکل آئے گی۔'

(۴)

رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔لوگ اپنے اپنے گھروں میں دُبکے پڑے تھے۔گھڑیال نے ایک کا گھنٹہ مار کر آدھی رات کے گزر جانے کا اعلان کر دیا تھا۔بدبو کی دھیمی لہر اب بھی گلیوں شاہراہوں سے ہو کر گزر رہی تھی۔کبھی کبھی کسی موڑ سے اچانک کسی آوارہ کتے کی کی ایک تیز صدا بلند ہو جاتی اور کبھی تین چار کتوں کی جماعت مل کر زوروں میں الاپ کرنے لگ جاتی۔اندھیرا اور بھی بھیانک لگنے لگتا۔

سناٹے میں سانس روکے ہوئے دو سائے تیزی سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ان کے قدم چوروں کی طرح اٹھ رہے تھے—پاؤں داب داب کر اور آس پاس دیکھتے ہوئے چل رہے تھے......

اچانک دونوں ہی سائے ٹھٹھک کر رک گئے۔

''تم نے کوئی آواز سنی''

''ہاں ایسا لگتا ہے جیسے کوئی پیچھا کر رہا ہو''

''اب کیا کیا جائے۔''

''آگے گلی ہے۔ہم وہاں چھپ جائیں گے......آؤ''

پہلا سایہ دُبک کر بیٹھ گیا اور جانوروں کی طرح رینگتا ہوا گلی کی طرف بڑھنے لگا۔دوسرے نے بھی اُس کی تقلید کی۔دونوں دبے پاؤں گلی میں داخل ہو گئے۔اور سانسیں روک کر دبک کر بیٹھ گئے۔

سڑک کے دائیں موڑ سے ایک کتا زوروں میں چلایا اور دوسرے کئی کتے سامنے سے دوڑتے ہوئے چلے گئے۔اور اس کے فوراً بعد ہی محلے کے چوکیدار نے پول پر ایک بے مقصد ڈنڈا گھمایا اور ہانک لگائی......

''جاگ کے سوئیو......جاگ کے سوئیو......''

ایک نے خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے دوسرے کی جانب دیکھا دوسرے نے دلاسا دیا......

''ڈر کی کوئی بات نہیں...... یہ چوکیدار اپنا یار ہے۔اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم چور نہیں ہیں۔''

چوکیدار دائیں ہاتھ میں ٹارچ لئے اور بائیں ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا دونوں کے قریب آ کر ٹھہر گیا......ٹارچ کی روشنی جب دونوں کے چہروں پر پڑی تو دونوں بغل میں بنڈل دابے کھڑے ہو گئے......

''اوہ تم ہو......اتنی رات گئے'' چوکیدار آہستہ سے بولا۔

''کیا کروں رامو بھیا۔آج بہت کام باقی ہے۔دیکھ رہے ہو نا یہ بنڈل۔''

آج کل پولیس کی گشت بہت بڑھ گئی ہے ...... بچ کے رہنا۔ چوکیدار پھسپھسایا۔

''اب کیا ڈرنا۔'' ان میں ایک ہنسا'' ہم تو گھر سے ہی موت کو ساتھ لے کر چلے ہیں۔''

چوکیدار چپ ہو گیا۔ بڑی دیر تک چپ رہا۔ شاید کچھ سوچ رہا تھا— جب اچھی طرح سے سوچ چکا تو اُن دونوں کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

''ایک بات پوچھوں بابو۔ تمہارے یہ اشتہار لگانے سے کیا بدبو کم ہو جائے گی؟''

چوکیدار کی آنکھوں میں کوئی طنز نہیں تھا بلکہ ایک تجسس چھپا تھا۔ جو وہ دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دونوں آہستہ سے مسکرائے۔ پھر چوکیدار کو دیکھ کر بولے۔

''رامو بھیا۔ ان اشتہاروں کے لگانے سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم بدبو ختم کرنے کی کوئی نئی تدبیر کر رہے ہیں۔ جنہیں تدبیر کرنا ہے وہ تو کر ہی رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود بدبو بڑھتی جا رہی ہے۔ مریض بڑھتے جا رہے ہیں۔ اب ذرا تم بھی میرے انداز سے سوچو رامو، ہمارے درمیان ایک ایسا بھی غریب طبقہ ہے۔ جو بھوکوں مرتا ہے اور اس کی کوئی نہیں سنتا— جو مریض بن کر ہاسپٹل جاتا ہے اور اس کی سنوائی نہیں ہوتی— اور ہاسپٹل سے باہر کر دیا جاتا ہے۔ اب بتاؤ ہمارا یہ بھائی اب کہاں جائے گا...... دراصل یہ ملک ایک مکان ہے۔ جہاں ہم سب رہتے ہیں۔ ہم میں سے ایک شخص کو گھر کا مالک بنا دیا گیا ہے۔ وہ گھر چلانا نہیں جانتا تو ہم اُسے سمجھائیں گے۔ بتائیں گے۔ اور اُس پر بھی گھر کی حالت بگڑتی رہی تو ہم اُسے نکال سکتے ہیں۔ اُس کا فرض ہے کہ وہ گھر میں رہنے والے تمام لوگوں کے ساتھ یکساں

طریقے سے پیش آئے۔ اور تم جانتے ہو۔ آج یہی نہیں ہو رہا ہے......

''......ہم ان بنڈلوں کے ذریعے اُس مکان مالک سے صرف یہ وعدہ لینا چاہتے ہیں کہ وہ اس طبقے کی طرف بھی دھیان دے جس کی طرف کوئی خیال نہیں کرتا۔ ان بے چارے لاوارث کنگالوں پر رحم کھائے۔

وہ چپ ہوا تو چوکیدار کے چہرے پر غم سمٹ آیا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو بابو......بھگوان تمہیں کامیابی دے۔ اب دیکھو نا، شروع میں تو بدبو مارنے کی دوائیاں مفت ملتی رہیں۔ پھر راشن کارڈ سے ملنے لگیں اور اب اس قدر بلیک مارکیٹنگ چل رہی ہے کہ......

چوکیدار اچانک چپ ہو گیا اور ناک سکوڑ کر بڑبڑایا......

''اُف کتنی تیز بدبو ہے۔''

پھر دونوں کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا......''اچھا تو دوستو میں چلا......تم اپنا کام کرو''

پھر اُس نے ایک زوردار ہانک لگائی ......'' جاگ کے سوئیو......'' اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں، اب ہمیں واقعی کام میں لگ جانا چاہئے......

آؤ امت! بنڈل کھولو......

اُمت نے بنڈل کھول لیا۔ ایک اشتہار نکالا......انجم نے اُس پر گوند لگایا ......اور دونوں اشتہار چسپا کرنے میں لگ گئے......

اشتہارات بڑے عجیب عجیب قسم کے تھے— دونوں مستعدی سے اپنے کام میں مشغول تھے۔

ایک اشتہار میں ایک غریب آدمی کی تصویر بنی ہوئی تھی — جو بالکل ہڈی ڈھانچہ ہو رہا تھا...... وہ ندی کے کھولتے ہوئے پانی کے درمیان بالکل بے بس کھڑا تھا۔اوراس سے ذرا سے فاصلے پر بدبو کے کئی پیکٹ بہتے ہوئے چلے جا رہے تھے...... اوراشتہار کے ایک طرف موٹے حرفوں میں لکھا تھا۔

''ان کی مدد کرو......ان کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہیں کہ چل کر پیکٹ لا سکیں — انہیں مفت پیکٹ تقسیم کرو۔

دوسری تصویر ایک عورت کی تھی۔ جو بدبو کی لہروں کے درمیان کھڑی تھی ......اس کا جسم زخموں سے چور چور تھا۔ وہ ایک ہاسپٹل کے دروازے پر کھڑی تھی اور دربان اُسے جگہ کی تنگی سمجھا کر باہر نکال رہا تھا۔

''اس کے نیچے لکھا تھا......غریبوں کو پہلی سہولت دو''

تیسری تصویر ملک کی سیاسی حالت پر روشنی ڈال رہی تھی۔ ایک موٹا شخص مسند پر بیٹھا ہوا اپنے کانوں میں انگلی ڈالے تھا۔ اُس کے آس پاس سیکڑوں ہزاروں لوگوں کا مجمع تھا۔ جو چیخ رہے تھے اوراس موٹے شخص پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ تھا۔

اس کے نیچے لکھا تھا— تم اپنی بپتا کہو۔ چاہے جیسے کہہ سکتے ہو— بار بار کہو کہ اس شخص کے کانوں میں تمہاری آواز چلی جائے— اور اُس پر بھی یہ کان بند کئے رہے۔تو تمہارا فرض ہے کہ اس کا کان کھلوا دو۔'

غرض اس طرح کے بہت سارے اشتہارات تھے۔ جن میں بدبو کے خلاف طرح طرح کے نعرے سلگ رہے تھے۔ ہر تصویر بہت واضح تھی۔اتنی واضح اور صاف کہ آرام سے ایک معمولی آدمی بھی سمجھ سکتا تھا۔

رات گزرتی جا رہی تھی اور وہ دونوں اشتہارات دیواروں پر چسپاں کرتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ کہ اچانک انجم ٹھہر گیا۔

''تم نے محسوس کیا امت۔کوئی دبے پاؤں تیزی سے ہماری جانب آ رہا ہے۔اورکوئی واقعی ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔داب کر چلنے کی ہلکی ہلکی آواز رات کے سناٹے میں بڑی خوفناک معلوم ہو رہی تھی......

''ہاں کوئی ہے'' انجم خوف سے بولا۔

''کون ہوسکتا ہے؟''

کوئی پولیس والا۔''

انجم کی آنکھیں چمک رہی تھیں......ابھی بہت سارے پوسٹر چپکانے باقی ہیں۔ آؤ چلیں چھپ جائیں۔ان گلیوں میں وہ ڈھونڈھنا چاہیں بھی تو نہیں ڈھونڈھ سکتے۔''

پھر دونوں گلی میں چوروں کی طرح بڑھ گئے۔کوئی کتا پھر کسی مقام سے الاپا اور کئی کتوں کی الاپ کی آواز فضا میں گونج گئی۔

اوراس سے قبل کہ دونوں سنبھلتے ایک سرچ لائٹ دونوں کے چہروں پر پڑی ساتھ ہی ایک بے ہنگم سی آواز بھی سنائی پڑی۔

''وہ رہے دونوں''

''سالے بھاگ کے جائیں گے کہاں۔''

''پکڑو''

''سالے بدبو پھیلاتے ہیں''

پھر پولس والے ڈنڈا لے کر دوڑ پڑے۔

''امت بھاگو۔''

''انجم زور سے چیخا...... پوسٹرس لے کر بھاگو۔''

گلیوں میں کتے اب بھی بھونک رہے تھے۔اور رات کے اندھیرے میں دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ تاریکی کے صفحات پر خوف بو رہی تھی......

دونوں کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ پوسٹرس تھامے ہوئے ہاتھ دردکر گئے تھے۔ پاؤں دوڑتے دوڑتے شل ہو گئے پولس والے پیچھے رہ گئے تھے۔

سالے بچ کر کہاں جائیں گے۔''

انجم نے چلتے چلتے کہا......

''امت۔ گھبراؤ نہیں۔ دائیں والی گلی سے ہم مہاجن ٹولی نمبرا میں داخل ہو جائیں گے۔ آگے چوراہے پر میرا گھر ہے۔ پھاٹک پھاند کر اندر داخل ہو جائیں گے۔''

پھر دونوں گلی گلی بھاگتے ہوئے اندھیرے میں کھو گئے۔

پولس والے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ دونوں گیٹ پھاند کر اندر داخل ہو گئے۔ ذرا ٹھہر کر لمبی لمبی سانسیں چھوڑیں...... جواس بحال ہوا تو دروازے پر ہلکے سے دستک دی۔

کریم بیگ اٹھ گئے......دروازے پر کوئی ہے۔

آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو پسینے میں شرابور دونوں کھڑے تھے——

''کیا ہوا اس طرح ڈرے ہوئے کیوں ہو۔''

''ہم یہ پوسٹر چپکانے گئے تھے۔''

انجم نے آہستہ سے بتایا۔ پولیس ہمارے پیچھے لگ گئی ہے۔

کریم بیگ ایک دم سے چپ ہو گئے۔ جیسے کاٹھ مار گیا ہو۔ آہستہ سے بولے۔

میرے بچو......!

پیارے بچو! میں جانتا ہوں تمہاری پیشانیوں پر جھوٹ نہیں لکھا مگر یہ سچ تم کس کس کو دکھا سکتے ہو؟ اور کون انہیں سمجھ سکتا ہے—— تم اپنے خیالات کو عوام کے

سامنے لانا چاہتے ہو اور حکومت سے تحفظ و امان کا وعدہ لینا چاہتے ہو......حکومت ان وعدوں کو زہر تصور کرتی ہے——

کریم بیگ ہانپ رہے تھے۔

''میں یہ بھی جانتا ہوں بچو! یہ اشتہارات کورے اور بے معنی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ اثر رکھتے ہیں اور اتنا اثر رکھتے ہیں کہ ایک زمانے کی آواز بن جاتے ہیں۔ ایک لڑائی ہم نے بھی لڑی تھی مگر وہ ملک کی محبت کی لڑائی تھی۔ ایک لڑائی تم لڑ رہے ہو—— یہ ملک میں پھیلی ہوئی بدبو کے خاتمے کی لڑائی ہے۔ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔'

کریم بیگ نے ایک گہری سانس کھینچی۔ پھر دونوں کی آنکھوں میں جھانکا۔

''آؤ میرے بچو! اندر چلو اپنے چھپنے کا انتظام کرو۔ ورنہ تمہیں وہ لوگ نظر بند کر دیں گے۔''

دونوں بغیر کچھ بولے اندر آ گئے۔

کریم بیگ نے آہستہ سے کہا......کیسا برا وقت آ گیا ہے بیٹو! تمہیں ایک صحیح کام کرنے کے لئے بھی اس طرح چوروں کی طرح چھپنا پڑ رہا ہے——'

''ہم ڈرتے نہیں ہیں ابا۔ بس خوف یہی ہے کہ ہمارا کام رک جائے گا۔''

انجم کی آنکھیں پھیل گئی ہیں۔

اور امت غصے میں کہہ رہا تھا...... وہ سچ پر مہر نہیں لگا سکتے......نہیں لگا سکتے......

اور کریم بیگ خاموشی کے گہرے اندھیرے میں، جو کبھی آزادی کے وقت پیدا ہوا تھا......ڈوبتا ہوا کہہ رہا تھا۔

''میرے بچو! یاد رکھو۔ جب بھی—— اپنی عزیز جان پر ترس کھاؤ تو سچ مت بولنا...... ہاں سچ مت بولنا...... کہ یہ ایک جرم ہے......ایک ناقابل معافی جرم ہے——

آج کے نئے بنائے گئے دستور میں ......اور کسی کی زبان سے کوئی سچ نہ نکلے ۔اس واسطے ہر شاہراہ پر ایک قاصد مقرر ہے— فوراً تمہاری زبانیں کاٹ ڈالی جائیں گی...... یہاں تمہاری کم عمری پر ترس نہیں کھایا جائے گا...... بلکہ یہ کہہ کر پہرہ بیٹھا دیا جائے گا کہ تمہارے ہونٹوں سے نکلا ہوا سچ کل انقلاب بھی بن سکتا ہے۔''

جسم میں لرزہ طاری ہوا۔اور اسی وقت چند دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ دروازے پر آ کر ٹھہر گئی اور دروازہ مسلسل دستکوں سے گونج اٹھا۔

کمرے میں سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔''اب کیا کیا جائے۔''

ہم بری طرح سے پھنس چکے ہیں۔''

اب کوئی راستہ نہیں ہے سوائے ......'' کریم بیگ مردہ سانس لیتے ہوئے بولے۔

انجم نے اعتماد بھری نظروں سے امت کو دیکھا اور کہا......'' امت! تمہیں پول پر چڑھنا آتا ہے نا؟ کھڑکی سے پول کی دوری کچھ زیادہ نہیں ہے۔تم بھاگ جاؤ۔ ہم میں سے کوئی بھی بچا رہا......تو یہ لڑائی آخری وقتوں تک جاری رہے گی۔''

امت نے مدافعت کی تو انجم دہاڑا......

''امت! میں کہتا ہوں بھاگ جاؤ— تمہارا بھاگنا بے حد ضروری ہے۔''

اور اس وقت جب دروازہ مسلسل دستکوں سے گونج رہا تھا، امت اُچک کر ٹیبل کے سہارے کھڑکی تک پہنچ چکا تھا۔زمین سے کھڑکی کی اونچائی کوئی زیادہ نہ تھی۔کھڑکی میں کسی طرح کی سلاخ وغیرہ بھی نہیں تھی۔اور اتنی جگہ تھی کہ بہ آسانی ایک آدمی بیٹھ سکتا تھا۔ پرانے زمانے کا مکان ٹھہرا، اب ایسی عمارتیں بنتی کہاں ہیں۔ امت کھڑکی تک پہنچ چکا تھا۔اور دوسرے ہی لمحہ وہ دونوں ہاتھوں کے سہارے پول تک پہنچ چکا تھا۔

کریم بیگ نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔کچھ لوگ دھڑ دھڑاتے ہوئے اندر گھس آئے......اور سرخ سرخ آنکھوں نے انجم کی طرف دیکھا...... جو بغیر کسی خوف کے آنکھیں مٹکا رہا تھا۔

'' پکڑ لو۔'' ان میں سے ایک چیخا۔

''اس کے ساتھ ایک اور تھا۔'' دوسرا دہاڑا— ''پوسٹرس کہاں ہیں''

انجم نے کچھ نہ سمجھ پاتے ہوئے کہا۔'' کیسے پوسٹرس؟''

''وہی جو رات کے وقت تم سالے چپکاتے پھرتے ہو۔''

''میں تو ابھی سو رہا تھا'' انجم نے معصومیت سے کہا۔''

''ابھی پتہ چل جاتا ہے۔''

دوسرے نے گھر کی تلاشی کا اشارہ کیا۔ پہلا دس بارہ منٹ تک ادھر اُدھر کچھ تلاش کرتا رہا۔ پھر لوٹ آیا۔

'' کچھ نہیں ملا۔''

'' کہاں دفنا دیا پوسٹرس''

''میں نے کہا نا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔''

''ابھی پتہ چل جاتا ہے۔جیل میں اچھے اچھوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔

چوکیدار نے دو کا گھنٹہ مارا۔

اور ٹھیک اس وقت۔جس وقت پولس انجم کو گرفتار کر کے لے جا رہی تھی۔

ڈرین پائپ سے ہوتا ہوا، لپٹا ہوا پوسٹرس موریوں میں بہتا چلا جا رہا تھا۔

باب چہارم

نمیتا

(۱)

رات کتنی پراسرار ہوا کرتی ہے۔ کیسے کیسے عجیب وغریب واقعات سے بھری ہوتی ہے۔ وہ رات بھی دوسری عام راتوں کی طرح تھی— تاریک اور پراسرار۔ شہر میں کتے چیختے چلاتے پھر رہے تھے۔ بدبو کے آوارہ جھونکے انگڑائیاں لے رہے تھے اور...... بوجھل افسردہ، چاروں طرف چوروں کی طرح دیکھتا ہوا وہ آگے بڑھ رہا تھا۔

ہولناک سناٹا کسی گہرے اور آنے والے سنگین خطرے کا پیش خیمہ لگ رہا تھا۔ یہ نوجوان امت تھا۔

امت کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا......آنکھوں میں خوف سلگ رہا تھا۔ وہ انجم کے بارے میں سوچ رہا تھا......انجم، جسے کھینچتے ہوئے اس کے سامنے سے پولس لے کر گئی تھی......جواب تک پولیس کے بے رحم ہاتھوں کی کتنی ہی اذیت جھیل چکا ہوگا......مگر ہونٹ ہمیشہ کی طرح اس کی مستقل مزاجی اور خود اعتمادی کی چغلی کھا رہے ہوں گے......

بدبو کی لہر میں سارا شہر ڈوبا ہوا تھا۔

امت تیزی سے آگے بڑھا۔اس کا گھر آ گیا تھا۔ چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا— آنکھوں میں لہو کے ڈورے رقص کر رہے تھے۔ دروازے پر آہستہ سے دستک پڑی اور فوراً ہی دوروازہ کھل گیا۔

سامنے ہی نمیتا کھڑی تھی۔ بال الجھے ہوئے بے ترتیب...... چہرہ سپید— کمسنی میں طاری ہوئے خوف کی چغلی کھاتے ہوئے ......اور آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرائی ہوئی سی......

امت ہانپتا ہوا اندر داخل ہو گیا...... نمیتا کے حیران چہرے پر اُگے ہوئے
متعدد سوالوں میں ایک اور سوال کا اضافہ کرتا ہوا بولا۔

''دروازہ بند کرلو......''

سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

''کیا ہوا بھیا؟''

''نمیتا کی آنکھوں میں دہشت پھیل گئی تھی۔

''وہی جس کا ڈر تھا۔ انجم پکڑا گیا۔

امت کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔اور نمیتا کو اپنی سانس ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اسی انداز میں اور اُسی کمزور لہجے میں آہستہ سے بڑبڑائی......پکڑا گیا......

روشنی ہمیشہ کی طرح غائب تھی......آدھی رات کا چاند آسمان پر روشن تھا...... اور اپنی دودھیا چاندنی پھیلا رہا تھا۔تاریکی میں دونوں کے چہروں پر پیدا ہوئے کرب کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔

اور ان سے ذرا سے فاصلے پر پتھر کی مورتی کی طرح کھڑے تھے...... ہیڈ ماسٹر رگھو پتی سہائے جی— چہرہ جیسے ہر تاثر سے عاری۔آہستہ سے اٹھے۔مدھم جلتے ہوئے لالٹین کو اٹھایا...... اور مضمحل قدموں سے ان دونوں کی طرف بڑھ گئے ۔ انہوں نے نمیتا اور امت دونوں کی گفتگو سن لی تھی۔لالٹین کو ایک طرف رکھا۔اور لالٹین کی مدھم روشنی میں دونوں کے چہروں پر طاری ہوئی سناٹگی کا جائزہ لیا۔اور پاس پڑی ہوئی اکہری چوکی پر تھکے ہارے پسر گئے۔

کبھی کبھی انسان باتیں نہیں کرتا۔ چپ رہتا ہے اور چپ رہ کر بھی گھنٹوں گفتگو کر لیتا ہے۔خاموشی میں خطرے کی بو سونگھ لیتا ہے اور اُداس ہو جاتا ہے۔اور یہاں اس وقت یہی خاموش فلم دکھائی جا رہی تھی۔

امت نے چوکی کے پاس رکھے ہوئے گھڑے سے گلاس میں پانی ڈھالا اور غٹ غٹ کر کے پی گیا۔ کچھ دیر کے بعد رگھو پتی سہائے جی نے خود کو کسی لائق بنایا۔لفظ جوڑے اور نظریں نیچی کئے ہوئے امت سے بولے۔

''تھک گئے ہو تو ستا لو......ذہن پر پڑا ہوا بوجھ اتر جائے گا۔''

''بوجھ ہلکا ہو تو اُتر جائے۔ملک کے نئے تازہ دماغ کو یہ لوگ قید خانے میں قید کریں گے تو نیند کہاں سے آئے گی۔''

رگھو پتی سہائے جی نے ہار مان لی ۔سر جھکا لیا ...... اور کمزور لہجے میں بولے۔''پھر بھی بیٹے کوشش کرو گے تو نیند آ جائے گی۔''

''نہیں بابو جی نیند نہیں ہے''

''اب کیا ارادہ ہے بھیا۔''نمیتا پوچھ رہی تھی۔

''اب باہر نکلنا ہوگا۔کام کا بوجھ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔اور چپ بیٹھنے کا مطلب ہے کہ بوجھ اتنا بڑھ جائے گا کہ پھر جینا مشکل ہو جائے گا۔ہم لوگوں نے محلے کے اچھے لڑکوں کی ایک جماعت تیار کی ہے جو سارے شہر میں اپنے اپنے انداز میں ورک کرے گی۔ کام کی نوعیت مختلف ہے ۔سب کو الگ الگ کام بانٹ دیا گیا ہے......جیسے کچھ لوگوں کا کام ہے بدبو کے بیمار مریضوں کو ہاسپٹل میں بھرتی کروانا۔ ہاسپٹل میں ان کے لئے انتظام کرنا......حقوق کے لئے لڑنا ہوگا۔پوسٹرس چپکانا— اسٹریٹ ڈرامے کرنا۔گاؤں گاؤں گھوم کر اپنے مشن کی تبلیغ کرنا— ہمیں انجم کی غیر موجودگی میں کام کو روکنا نہیں ہے۔

نمیتا سنتی رہی ...... پھر کچھ سوچ کر بولی ......''بھیا میرے لئے بھی کچھ کام ہے۔''

امت نے نمیتا کی طرف دیکھا۔کچھ بولا نہیں۔

نمیتا نے دوبارہ کہا— سمجھ میں نہیں آتا بھیا۔تم ہم لوگوں کو اتنا کمزور کیوں سمجھتے ہو۔تاریخ کی کتابیں پڑھنے کے باوجود تم لوگ ہمیں کمزور کیوں سمجھتے ہو۔ مجھے لگتا ہے، مجھے تمہارا ساتھ دینا چاہئے—

پھر اُس نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔کل سے میں بھی چلوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔اس بدبو میں اب سانس لینا دوبھر ہو گیا ہے''

ماحول میں سناٹا چھا گیا۔ اچانک کوئی جھینگر چیخا۔امت اکھری چوکی پر ہی پسر گیا۔ بابا اٹھے اور لالٹین لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ نمیتا بھی اپنے کمرے میں لوٹ گئی—اس وقت اس کے دماغ میں زبردست طوفان آیا ہوا تھا۔اور وہ دیکھ رہی تھی ......انجم جیل کی تنگ سلاخوں کے پیچھے پولیس کے بے رحم ہاتھوں کا نشانہ بنا ہوا ہے۔

وہ رو رہی تھی......اُس کی آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے۔

(۲)

کریم بیگ انسان تھے کوئی فرشتہ نہیں تھے۔ بیٹے کے جیل چلے جانے کا صدمہ اُن کے لئے ناقابل برداشت تھا۔اندرونی زخموں کی تاب نہ لاکر بکھر گئے۔مگر اس کے باوجود چہرے پر ایک شکن نہ تھی۔رضیہ کو بھی بار بار سمجھا رہے تھے۔کہ تم بلاوجہ فکر میں مری جاتی ہو۔ یہ کیوں نہیں سوچتی کہ ہم جس دور میں جی رہے ہیں اور جن آندھیوں نے ہماری زندگی کو دوزخ بنا دیا ہے ان آندھیوں کو روکنے کے لئے کسی نہ کسی کو تو اٹھنا ہی ہوگا......ہمیں بھی آج تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ملک میں پھیلی ہوئی بدبو کے خلاف جہاد کی ضرورت ہے کہ ایسا حکم دیا گیا ہے اور آج صرف ہمارا انجم نہیں

اٹھا......بلکہ مختلف انجم اٹھ کھڑے ہوئے ہیں— ہمیں خوش آمدید کہنا چاہئے انہیں۔

اور دیکھنا......تب یہ ملک ...... ہمارے اپنے لہو سے سینچا گیا یہ ملک ایک مثالی ملک بن جائے گا......اور اس خوفناک آندھی کا دور دور تک پتہ نہ ہوگا۔

انجم واپس لوٹے گا۔

جیل اس کی منزل نہیں بن سکتی......

کریم بیگ سمجھانے تو تو سمجھا آئے مگر اپنے دل کو کیسے روکتے......اپنے بے قابو خیالات پر کیسے قابو پاتے......ابھی دو روز قبل وہ انجم سے ملنے بھی گئے تھے......اور آنکھوں نے ایک نئے انجم کو دیکھا تھا......اپنے سے بھی بزرگ انجم کو......اپنے سے زیادہ تجربہ کار انجم کو...... جوان سے کہیں زیادہ زخم رکھتا تھا......جوان سے کہیں زیادہ جھیلنے کی قوت رکھتا تھا...... ہونٹوں پر سکون بھری مسکراہٹ طاری لیے۔نظریں نیچی کر کے وہ بس اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

''ابی حضور! آپ دوبارہ ملنے نہیں آنا......وعدہ کرو دوبارہ نہیں آنا......کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کمزور پڑ جاؤں......''

''ہاں نہیں آؤں گا بیٹے— کریم بیگ نے جھک کر اپنے آنسو پوچھے— ہاں نہیں آؤں گا......اس دل کو سو طرح کے بہلاوے دے چکا۔اب بھی دے دوں گا ......مگر نہیں آؤں گا......مگر بول تو لوٹے گا نا......ویسا ہی خوش رنگ لباس پہن کر......جیسا کہ میری آنکھوں میں نظر آتا ہے......جیسا کہ محبت کا لباس ہوتا ہے......اور جیسا کہ محبت کرنے والی آنکھیں دیکھتی ہیں اور خوش ہو لیتی ہیں ...... بول تو لوٹے گا نا......؟''

سارے راستے دھیمی دبی سرگوشیوں کا طوفان ان کے ذہن پر چھایا رہا۔

اس دن صبح کا کوئی دس بجا تھا۔

ادھر کئی روز سے کریم بیگ آفس بھی نہیں جا سکے تھے۔آج جب ذہن نے نئے سرے سے سوچنا شروع کیا تو تسلی ہوگئی۔اور وہ آفس جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ اس بیچ امت ان کے گھر کے کئی چکر کاٹ چکا تھا...... چاچا، چاچا کہتے ہوئے اُس کے منہ ہی نہیں تھکتے تھے...... ایک دوسرا انجم ان کے سامنے تھا۔کبھی باتیں کرتا۔ ہنستا ہنساتا۔سودا سلف لاتا......رضیہ کے پاس گھنٹوں بیٹھتا اور اُس پتھر کی مورتی میں جان پھونکنے کی کوشش کرتا......اور ایسے موقع پر کریم بیگ اتنا ضرور سوچتے۔

مذہب کی دیواریں کھڑی کرنیوالے...... مذہب کو آسان طریقے پر کیوں نہیں قبول کرتے......؟ مذہب تو ایک سیدھا سادا راستہ ہے جہاں شرن لے کر انسان تمام تر برائیوں سے نجات حاصل کرلیا ہے—— تمام تر نفسانی خواہشات سے بری ہو جاتا ہے۔ اکثر ان کے دل میں خیال آیا کہ اگر مذہب نہ ہوتا تو ؟ یہ سوچ انہیں اس کریم بیگ کے پاس لے جاتی جو ایک طویل مدت تک مذہب سے کافی دور رہا۔اور بالآخر قریب آیا...... کہ یہی وہ راستہ ہے جہاں تمام تر خودغرضیاں آکر فوت کر جاتی ہیں۔تمام الجھنیں یہیں آکر ختم ہوجاتی ہیں......اور اکثر یہ بھی خیال آیا کہ صرف ایک مذہب ہوتا تو...... مذہب کی یہ بھیڑ نہ ہوتی تو......؟

یہ خیالات معمولی سہی۔مگر عرصہ دراز کے بعد مذہب کی شرن میں آئے ہوئے کریم بیگ کو انہی خیالات نے حوصلہ دیا تھا۔آدمی جب کمزور پڑ جاتا ہے تو وہ خود سے سوالات کیا کرتا ہے۔سوال جب الجھن بن کر اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں تو وہ خود ہی ان سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر ایک جواب پالیتا ہے اور یہ جواب اس کی تسلی کے لئے کافی ہوتا ہے۔

جانے کب تک وہ اپنے خیالوں کی کشتی پر تیرتے رہے۔قریب دس بجے وہ

آفس چل دیئے......

ٹائپ رائیٹر مشینوں کی کھٹ کھٹاہٹ کے بیچ جانے کیوں وہ ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے ایک عجیب طرح کی خاموشی آفس کے اطراف میں پسری ہوئی ہو۔ سلمہ کی یاد تازہ ہوئی تو کریم بیگ نڈھال سے ہوگئے۔خود کو بحال کیا اور آفس کی سیڑھیاں طے کرنے لگے۔

دو ہی سیڑھی پار کی تھی کہ رگھو بیر نے آواز دے کر پکار لیا۔

کریم بیگ اچانک ٹھٹھک کر رک گئے۔وہ بڑے غور سے رگھو بیر کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ہنس مکھ رگھو بیر کے چہرے پر وحشت سمٹ آئی تھی۔ چہرے پر جاذبیت کا ایک قطرہ نہ رہ گیا تھا۔گال دھنس گئے تھے۔ برسوں کا بیمار نظر آرہا تھا۔

''کریم بیگ ہمیں بچالو۔''

رگھو بیر گھگھیائی آواز میں بولا...... اُس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی......

''ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے کل تمہاری بات نہیں مانی اور آج ہمیں اس کا پھل بھگتنا پڑ رہا ہے۔صرف ہماری ہی نہیں بلکہ اب ہماری گھر والیوں کی عزت پر بھی خطرے کا آسمان ٹوٹ پڑا ہے......صاحب کے پنجوں میں لہو سمٹ آیا ہے......وہ درندہ ہے۔

رگھو بیر کی آواز میں کپکپی طاری ہوگئی تھی ...... ہاں ہم پہچان گئے ہیں کریم بیگ ! جو بات کل پارک ویو (Park-View) ہوٹل والی میٹنگ میں نہیں کہہ سکتے تھے، آج کہہ سکتے ہیں۔ بلند بانگ کہہ سکتے ہیں کہ صاحب درندہ ہے۔وہ پارٹیاں دیتا ہے۔دعوت دیتا ہے۔اور اس بہانے ہمارے گھر کی عزت پر ہاتھ رکھنا چاہتا ہے۔اپنی محبت لٹا کر ہماری انا خریدنا چاہتا ہے۔ہمیں کمزور بنانا چاہتا ہے۔تمہاری طرح ہم بھی اپنی کمزوریاں پھینک ڈالنا چاہتے ہیں کریم بیگ!''

رگھوبیر سسک رہا تھا۔'' کریم! ہم سے خوشی چھین لی گئی۔چین چھین لیا گیا۔ ہمیں نئی دنیا کا قیدی بنایا گیا اور رہا سہا سکون بھی لوٹ لیا گیا۔اب گھر کے باریک رشتوں کی آنکھوں سے بھی اپنے لئے وحشت اور نفرت جھانکتی ہے۔انھیں اس بدبودار فضا میں لے جانے کے مجرم بھی تو ہم ہی ہیں نا؟اور اب وہ گھر جہاں ہم اپنے رشتے کی مضبوطی کے ساتھ جیا کرتے تھے،اب جہنم بن چکا ہے،ہمارے لئے۔ہم کہیں کے نہ رہے۔ہمیں بچالو............بچالو......

کریم بیگ سن رہا تھا اور رگھوبیر اپنی ہزیانی کیفیت میں بکے چلا جارہا تھا......

''وہ درندہ ہمارے پسینوں کی مہک پہچان چکا ہے رگھوبیر......ہمیں بچالو ......وہ ہماری جان لے لے گا۔ہم کس کے لئے کماتے تھے۔کریم۔کس کے لئے اتنی دوڑ دھوپ اور محنت کیا کرتے تھے۔اُسی کے لئے نا جس سے ہمارے رشتوں کی کمزوری رہی تھی......ماں......بہن......بیٹی......اب وہ تعلق جب زہر بن کر ہم پر ٹوٹا ہے تو سہا نہیں جاتا۔''

بولتے بولتے رگھوبیر کی آواز بھاری ہوگئی تھی۔اچانک وہ پرسکون ہوگیا...... آنکھیں سکڑ گئیں اور ان میں خون اتر آیا۔پھر بے ہنگم نظروں سے اُس نے کریم بیگ کو دیکھا۔

''کریم بیگ!اب ہم نے ارادہ کرلیا ہے......پکا ارادہ......اگر وہ اور قریب آتا رہا تو___یا تو میں اپنا خون کر ڈالوں گا یا پھر اُسے مار ڈالوں گا......''

وہ سکتے میں آگیا تھا۔

رگھوبیر...........رگھوبیر...........

کریم بیگ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا___ہوش میں آؤ رگھوبیر___یہ

آفس ہے......ہوش میں آؤ......ہم آفس کی سیڑھیوں پر کھڑے ہیں......اس لئے ہوش میں آؤ......اور اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو چھٹی کی درخواست لکھو......گھر جاؤ ......اور اپنے جذبات پر قابو پاؤ......

''چھٹی کی درخواست لکھوں ......؟ بیماری کا بہانہ بناؤں اور گھر لوٹ جاؤں؟''......رگھوبیر پاگل سے لہجے میں کہہ رہا تھا......مگر کب تک کریم......کب تک؟ یہی ہوتا رہا تو یہ معمول بن جائے گا......اور سکون پھر بھی نہ لوٹے گا......اور اکیلے صرف میں کیسے قابو پالوں......آفس کے اتنے سارے اسٹاف......وحشت میں سمائے ہوئے یہ سارے چہرے......سب کیسے قابو پالیں...... جو آندھی کل تمہارے چہرے پر تھی وہ آج سب کی آنکھوں میں سلگ اٹھی ہے۔''

''تو جنگ کروگے؟'' کریم بیگ کو اس گفتگو نے تھکا دیا تھا۔

''ہاں''

اس سے لڑ پاؤ گے؟''

''ہاں''

اور اگر اُس نے تم سب کو مکھی کی طرح نکال باہر کیا تو؟''

''تو؟''

رگھوبیر اس بار واقعی کمزور پڑ گیا۔احساس پر جیسے منوں پانی پڑ گیا ہو......

''بس یہی کمزور پہلو ہے کریم۔بتاؤ نا ہم کیا کریں......اب اور سہا نہیں جاتا۔وہ یوں بھی تو ہمیں ختم کئے دے رہا ہے۔اور نوکری بغیر بھی ہمارا وہی حشر ہوگا......پھر کیوں نا......؟''

''تو مقابلہ کروگے؟'' کریم بیگ نے آدھے راستے میں ہی اُسے روک لیا۔

''ہاں''

رگھو بیر نے انتہائی سکون سے جواب دیا۔

''مقابلہ ہوش میں رہ کر کیا جاتا ہے رگھو بیر — اس طرح جذباتی بننے سے تم جیت نہیں سکتے۔ ہمیشہ کی طرح ہار جاؤ گے — اس لئے کہ جب تم جذباتی بنتے ہو تو درندے کی رگ شرارت کو مزید ہوا مل جاتی ہے۔ تم بے قابو ہو جاتے ہو۔ اور وہ تمہاری ناکوں میں نکیل ڈالتا ہے...... جیسے چاہتا ہے نچاتا ہے...... اور تم اُس کے اشارے پر ناچنے لگتے ہو...... اس لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اپنے اندر کی کمزوریوں پر قابو پاؤ...... اپنے اخلاق کو اونچا اٹھاؤ۔ تاکہ اخلاق کی کمزوریوں کے مجرم نہ بن سکو...... اور جس دن تم ایسا کر سکے...... اور تخت پر بیٹھا ہوا صاحب یہ جان گیا — اُس دن وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا...... کیونکہ تب وہ تمہاری طاقت سے باخبر ہو چکا ہوگا۔

کریم بیگ خاموش ہو گئے۔

رگھو بیر سر ہلا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ جانے کب تک ڈوبا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو کریم! ہم ہوش میں رہنے، خود پر قابو پانے اور جذبات کے اندر رہنے کی کوشش کریں گے۔''

پھر وہ کئی سیڑھیاں نیچے اُتر گیا۔

کریم بیگ آہستہ آہستہ چلتا ہوا۔ کمرے میں داخل ہوا۔ کچھ نظریں اُٹھیں اور جھک بھی گئیں...... ٹائپ رائٹر مشینوں کی کھٹ کھٹاہٹ گونج رہی تھی...... ان ہاتھوں کی کمزوریاں کریم بیگ سے چھپی نہ رہ سکیں...... چہروں کا خوف کریم بیگ سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔

ان میں رتھ بھی تھا۔ سموئل بھی...... ورما بھی تھا...... اسلم بھی...... اور...... مسز

بھٹنا گر بھی......

نظریں مسز بھٹنا گر پر ٹک گئیں اور جیسے مس نیلی کا سہما سہا چہرہ ان کی نظروں میں سما گیا۔ چہرے پر خزاں کا رنگ تھا۔ منہ سوجا ہوا۔ آنکھیں دھنسی ہوئی...... ایک پل کو ان کی نظریں اٹھیں...... پھر جھک گئیں...... کریم بیگ نے انتظار کیا مگر آنکھیں دوبارہ نہیں اٹھ سکیں...... نہ شور و غل کا طوفان تھا...... نہ نقرئی قہقہوں کی آوازیں......

کریم بیگ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مسز بھٹنا گر کے قریب پہنچ گئے اور ٹھہری ہوئی آوازیں بولے......

''کیسی ہو رتو......''

اچانک دو معصوم آنکھیں اٹھیں اور اُن پر لرزہ دینے والا بوڑھا پا طاری ہوا۔ پلکیں تھرا گئیں...... آنسو کے دو قطرے ڈھلکے اور رُخسار پہ بہہ گئے۔

''پاگل عورت'' — کریم بیگ دلاسہ دیتے ہوئے بولے — شکر کرو کہ دیر نہیں ہوئی۔ اور تم نے اُس انجانی آفت کو پہچان لیا۔ ابھی بھی وقت ہے رتو...... خود کو مضبوط کرو — ٹوٹنا اور بکھرنا جانوروں کا شیوہ ہے۔ انسانوں کا نہیں۔''

وہ بولتے رہے اور مسز بھٹنا گر سنتی رہی۔ پھر کریم بیگ بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے دوبارہ اپنی سیٹ پر لوٹ آئے۔ ہلکی ہلکی بدبو پورے کمرے میں اب تک پھیلی ہوئی تھی...... رجسٹروں سے...... فائلوں سے...... کھڑکیوں سے...... دروازوں سے ہلکے ہلکے بدبودار جھونکے کمرے میں رینگ رہے تھے۔

ذہن میں سیٹیاں بج رہی تھیں......

ابھی وہ ٹھیک طرح سے بیٹھ بھی نہیں پائے تھے کہ چپراسی نے آکر اطلاع دی ......صاحب بلا رہے ہیں...... ابھی اسی وقت......

اچانک خطرے کا سائرن ان کے دماغ میں گونج اٹھا...... اندر ایک سیلاب

ضرور اٹھا مگر کریم بیگ نے اس احساس پر قابو پا لیا...... اُٹھے اور تیز قدموں سے صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

صاحب ریوالونگ چیئر پر گھوم رہے تھے۔ کریم بیگ کے چہرے پر اس وقت بھی وہی ہلکی ہلکی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی ...... صاحب جھنجھلائے ہوئے دکھ رہے تھے...... اچانک صاحب کی مٹھّیاں غصے میں بھینچ گئیں اور وہ مشتعل نظروں سے اُسے گھورتے ہوئے بولے۔

''تم لیڈر ہو گئے ہو کریم بیگ......

تم نیتا ہو گئے ہو کریم بیگ؟

یا کوئی سدھ پرش، مہاتما ہو گئے ہو......؟

یا تم مسیحا بن کر لوگوں کے دکھ درد کا علاج کرنے آئے ہو......؟

تم انقلاب کے نعرے لگاتے ہو......'

میرے خلاف بغاوت پر آمادہ کرتے ہو......

صاحب کی آنکھیں شعلہ اگل رہی تھیں ......تم میرے خلاف بھڑکاتے ہو کریم بیگ...... حیرت ہے۔ تم مجھ پر الزامات کی بارش کرتے ہو...... غلط سلط افواہیں پھیلاتے ہو...... میرے خلاف نعرے لگواتے ہو...... مجھ پر جس نے تمہاری تقدیر کا سودا منظر کیا تھا۔ اور اس کمرے کی ایک باوقار کرسی تمہارے حوالے کی تھی۔ یہ میں تھا کہ تم بھوکوں مر رہے تھے اور میں نے تمہاری مدد کی تھی— تمہارے منہ میں آبِ حیات کے چند قطرے ڈالے تھے۔ اور تم نے الٹا ان احسانوں کا بدلا یہ دیا کہ لوگوں کو میرے ہی خلاف بھڑکانا شروع کر دیا...... میں پوچھ سکتا ہوں کیوں......؟''

صاحب غصے میں دہاڑے اور اس نازک وقت میں بھی کریم بیگ نے ہونٹوں پر رینگتے ہوئے تبسم کو مرنے نہ دیا۔

''صاحب! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ میں نے تو یہ سیکھا ہی نہیں —اور نہ میری مقدس کتابوں نے بھی مجھے یہ تعلیم دی— کہ جس مالک کا کھاؤں اُسی کی تھالی میں چھید کروں ...... ہاں میں اس بات کا مجرم ضرور ہوں کہ میں نے ان کے گونگے ہونٹوں کو آزادی دی۔ جو سچ ان کے پاس نہیں تھا وہ سچ لاکر دکھا دیا...... سچ کی عظمت سے آگاہ کیا...... بس اتنا ہی قصور وار ہوں......''

صاحب کے چہرے کا رنگ بدلا۔ طوفان لوٹ گیا—اب اُس کی جگہ مسکراہٹ آ گئی تھی۔ وہ ریوالونگ چیئر پر خود کو گھماتے ہوئے۔ کہہ رہے تھے۔

کریم بیگ! تم نے ابھی وہ ہاتھ نہیں پہچانے جو تمہارے سماج سے اوپر ہے۔ جس کے دم پر تمہارا سماج چلتا ہے۔ کھڑا ہوتا ہے۔ دوڑتا ہے— تم نے ابھی تک وہ آواز نہیں پہچانی جو تم پر پہرہ بیٹھا سکتی ہے۔ تمہیں بھری محفل میں رسوا کر سکتی ہے۔ تمہیں توڑ سکتی ہے۔ خیر میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔ مگر''

صاحب تھوڑا ٹھہرے۔ پھر اپنا فیصلہ سنا دیا— ''تم جس وقت بھوکے مر رہے تھے اور میں نے کمرے کی جو باعزت کرسی تمہارے حوالے کی تھی ...... تم صرف اُس کرسی کو خالی کر دو...... اور یہاں سے چلے جاؤ...... اب تم آزاد ہو......''

''جیسی مرضی''

کریم بیگ دروازے سے باہر نکل آئے۔

دور تک لمبی شاہراہوں کو دیکھتے رہے وہ اس فیصلے کو جانتے تھے۔ اور وہ نیا شخص...... جو اخلاق کی مضبوطی کے بعد پیدا ہوا تھا، ان سے کہہ رہا تھا......اس راستے میں مشکلیں تو آئیں گی ہی کہ یہ حق وصداقت کا راستہ ہے— مگر اب تمہیں گھبرانا نہیں ہے کریم بیگ۔

جو دنیا اور آخرت کی سلامتی چاہتا ہے۔ اُس پر لازم ہے کہ صبر کرے اور رضا

بالقضا رہے ...... اور مخلوق کے سامنے شکایت نہ کرے اور اپنی تمام ضروریات کو پروردگار کے سامنے پیش کرے اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے مشکل کشائی اور کشادگی کی امید رکھے کیونکہ وہی تمام مخلوق سے بہتر ہے''

حساب دینے کا وقت تو اب آیا ہے۔

اور وہ بھی دکھا دیں گے کہ وہ کمزور نہیں ہیں......مشکل سے مشکل وقت میں بھی حوصلہ نہیں چھوڑ سکتے۔

راستے کی طوالت نے تھکا دیا تھا۔ دماغ پر اچانک ایک بہت بڑا بوجھ آ گیا تھا۔ انجم جیل میں ہے اور وہ نوکری سے الگ۔

پھر جیسے ایک دھماکہ ہوا...... وہ آوازوں کے نرغہ میں تھے۔ اور آوازیں انہیں لہولہان کر رہی تھیں......

بھول گیا کہ ایسا تمام زمانوں میں ہوا ہے۔

بھول گیا کہ ایسا فتنہ اور شر ہر زمانے میں آیا......

اور جو لڑ نہیں سکے وہ اسیر ہو گئے......اُس کے گناہوں کے مرتکب ہوئے اور زوال پا گئے— آنکھیں کھول اور تاریخ کے اوراق پر نظر ڈال۔

''حضرت نوحؑ کے زمانے میں بھی ایسا ہی فتنہ اور فساد برپا ہوا۔ بے ہنگم آواز کے جنگل کے باشندے ود، سواع، یغوث لینوق اور سرد یوتاؤں کی مصنوعیات میں کھو گئے۔ نوحؑ نے سمجھایا مگر لوگ مخالفت پر اُتر آئے......زہریلے بیج بوتے رہے۔ فتنہ بپا کرتے رہے کہ یہ وہی تھے۔

وہی— جو عوام پر حکومت کرنے والے تھے— جو خود سر تھے جنہیں اپنی سیاست کے ختم ہو جانے کا خدشہ تھا......تو زوروں کی بدبو پھیلی— اور اُن کی چیخیں آسمانی پردوں میں سما گئیں۔

''کہ اے نوحؑ! اگر تم واقعی سچے ہو تو ہم پر عذاب لاؤ......جس سے تم ڈرایا کرتے تھے......''

اور آن واحد میں وہ ہو گیا کہ وہ جس کے بارے میں سوچ بھی نہ پائے تھے ......کہ ظلم عجب عجب صورتوں میں ہوتا ہے۔ سچ مختلف طریقے سے سامنے آتا ہے۔ حضرت نوحؑ کشتی کی تعمیر کر رہے تھے اور لوگ ہنس رہے تھے — قہقہہ لگا رہے تھے۔ ادھر کشتی کی تعمیر ہوئی۔ دروازے کھل گئے۔ زمین کے دریاؤں اور چشموں سے پانی اُبل پڑا۔ حضرت نوحؑ نے ہر قسم کے جانوروں کے دو جوڑے لئے اور کشتی پر سوار ہو گئے— زوردار سیلاب آیا۔ اور وہ لوگ جو سچ سے منکر ہوئے تھے۔ اُس کے عذاب میں کھو گئے۔

اور جو سلامت رہ گئے ان کی نسل سے ایک عظیم الشان قوم اٹھی اور جب اُس قوم کو عروج حاصل ہوا تو وہی شر، فتنہ، فساد اور بدبو کا مادہ ان کے اندر بھی داخل ہو گیا— یہ عاد قوم تھی جو اپنے بے جا غرور، اور اقتدار کی قوت میں کمزور قوموں کو خاطر میں نہ لاتی تھی— ظلم کرتی تھی اور بدبو چاروں جانب پھیلی جا رہی تھی......کہ اچانک قوم عاد پر عذاب نازل ہوا۔ ایک زبردست طوفان اٹھا اور گاؤں کا گاؤں دفن ہو گیا ......ہڈیوں کے قلعے تعمیر ہوئے اور اس طرح قوم فنا ہو گئی۔ اور وہ تھوڑے سے لوگ جو حضرت ہودؑ پر ایمان لائے تھے ان سے قوم ثمود اٹھی اور اس قوم کا بھی وہی حشر ہوا۔ جو دوسری قوموں کا ہوا......

اور پھر حضرت ابراہیمؑ، شعیبؑ، موسیٰؑ اور آں حضرتؐ تک غرض کہ ایک لمبی کہانی ہے......نمرود کی سلطنت تباہ و برباد ہوئی— لوط کی قوم پر پتھر کی آندھی نازل ہوئی۔ مدین والے بدبو کی زد میں بہہ گئے......کہ ان پر سائے کے دن کا عذاب آیا ......اور یہ سب ہوا......کہ اچانک ظلمت کا اندھیرا چھٹا اور فاران کی پہاڑیوں سے

اذان کی ایک تیز صدا بلند ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے عالم پر چھا گئی—اور رفتہ
رفتہ دن گزرے—ایک عقیدہ مختلف عقیدوں میں بٹ گیا...... باطل کا بول بالا ہو گیا
......حق وصداقت کی آواز خاموش ہو گئی......تو یہ ان کا اپنا عقیدہ تھا......اور ایسے ہی
دوسرے مذاہب کے بھی عقیدے ہوں گے...... کہ شر فتنہ اور فساد کی جگہ ایک دن بدبو
لے لے گی......تیز اور زبردست طریقے سے پھیلتی ہوئی بدبو......

کہ جان رکھو......

اُس کے عذاب کی صورت کچھ بھی ہو سکتی ہے......

وہ۔ جو سچ ہے اُس سے منکر نہ ہو......اور اپنے قدم مضبوطی سے جمائے رکھو......

کیا تم بھی خود کو اُن خودسر قوموں کی طرح چھوڑ دو گے...... کہ تم پر بھی ٹڈی
دل کا عذاب نازل ہو......خون کی بارشیں ہوں......تم پر پتھر برسیں......
اور تمام رشتے ختم ہو جائیں......اور تمہارے چہروں پر روشن آگ سلگ اٹھے......

افسوس......افسوس...... مذہب کو ایک ذریعہ بنایا گیا تھا۔ تیز بدبو سے بچنے
کے لئے......اور تم جھگڑ گئے......

تم سب ایک سخت امتحان سے گزر رہے ہو......

اور صاحب وہی خودسر حاکم ہے...... جو اپنی ظالمانہ سیاست کی بازیگری میں
تمہاری تقدیریں خریدتا پھرتا ہے۔

تو اس ناٹک سے بری ہو جاؤ کریم بیگ......

بری ہو جاؤ۔؟''

جب یہ آواز گونجی تو کریم بیگ کے اندر ایک لرزہ سا طاری ہوا۔ بدن کانپا
......زلزلہ سا جھٹکا محسوس ہوا...... پھر بھی ہمت نہ ہاری......آس پاس پھیلی ہوئی بدبو
بھانپتے ہوئے تیز قدموں سے گھر میں داخل ہو گئے۔

گھر میں سناٹے کی حکمرانی تھی...... باورچی خانے سے ہنڈیا اور کرچھل کے
گیت گونج رہے تھے۔ آہٹ پا کر رضیہ نے سر اٹھایا اور کریم بیگ کی غیر معمولی سنجیدگی
پر چونکتی ہوئی بولی۔

''کیا ہوا۔؟''

''مجھے نوکری سے الگ کر دیا گیا''

کریم بیگ آہستہ سے بولے۔

رضیہ کی آنکھوں میں آتش فشاں سلگ اٹھا۔ پیشانی پر چند قطرۂ غم سمٹ آئے۔

''اب کیا ہوگا''

'اس کے رزق پر بھروسہ رکھو۔ وہی کشتی پار لگائے گا'۔

اتنا کہہ کر کریم بیگ اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔ لے دے کر وہی سانپوں
کا پٹارہ اُن کے سامنے کھل جاتا۔ اور سانپ بین کی آواز پر ناچنے لگتے ......اپنے
بوڑھے وجود پر اب اور کتنی کیلیں ٹھوکو گے کریم بیگ؟ اب روزی کے لئے کہاں کہاں
بھٹکو گے اور وہ بھی اس شہر آشوب میں جہاں سچ کی تمام زبانیں کاٹی جا چکی ہیں—
تمہارے جیسے لوگ سچ کے اس کھوکھلے ڈھانچے کو لے کر ندی پار نہیں جا سکتے......

ان کی آنکھوں کے خواب مردہ ہو گئے تھے۔ آزادی کے بعد پھیلی ہوئی اس
بدبو اور اس کے نتائج سے ابھی تک وہ باخبر نہیں ہوئے تھے۔

محلے سے ایک عورت رضیہ کے پاس کچھ دیر تک بیٹھی۔ پھر چلی گئی پھر جنگل
کے آگ کی طرح سارے محلے میں یہ خبر عالم ہو گئی کہ کریم بیگ کی نوکری چلی گئی......
صاحب نے اُنہیں نوکری سے علیحدہ کر دیا ہے۔

شام ہوتے ہی محلے کے لوگ غم و غصہ ظاہر کرنے پہنچ گئے۔ وہ جب سے
نمازی ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے بہت قریب ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اب ان کا غم

محلے کا غم بن گیا تھا۔اس خوبصورت ماحول میں وہ بیحد خوش تھے۔

شام کے سات بجے سید صاحب اور شیخ صاحب بھی ٹپک پڑے۔ کچھ دیر تک ادھر اُدھی کی باتیں ہوتی رہیں۔آخر کار موقع دیکھ کر شیخ صاحب نے اپنے دل کی بات زبان پر لا ہی دی۔

’’کریم صاحب! اپنے محلے کی مسجد کے مولانا صاحب اب مدرسے میں چلے گئے ہیں۔جگہ خالی ہے۔اگر آپ اجازت دیں۔تو ہم آج ہی آپ کے نام کا اعلان کردیں۔امامت اب آپ کریں گے۔‘

کریم بیگ کے چونک گئے۔اتنی بڑی ذمہ داری—پہلے تو یقین ہی نہ آیا۔ پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

’’اس میں انکار کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔‘‘

شیخ صاحب نے دوبارہ مسکراتے ہوئے کہا۔’’ ٹھیک ہے۔مولانا کریم صاحب! جو ہم پہلے والے پیش امام صاحب کو دیا کرتے تھے۔وہی آپ کو بھی دے دیا کریں گے۔‘‘

شیخ صاحب چلے گئے۔

رات آدھی سے زیادہ ہوگئی ہے۔

عشاء کی نماز پڑھ کر لوٹتے ہوئے کریم بیگ سوچ رہے تھے۔اللہ اپنے بندوں کو بھوکے نہیں رہنے دینا۔اللہ ہی مالک ہے۔اللہ ہی انتظام کرنے والا ہے...... مگر انہیں کیا معلوم تھا...... بدبو سے پیدا ہوا ایک زہریلا جانور بہت دیر سے اُن کے تعاقب میں ہے—اور انہیں آتشی نظروں سے دیکھے جا رہا ہے۔

(۳)

انجم کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔اور گرفتاری کے لئے ثبوت کی ضرورت ہی کیا تھی۔

رات کے اندھیرے میں۔جب گلیوں کے کتے بھی سو گئے تھے...... دو خاکی وردی والے انجم کو کھینچتے ہوئے لے گئے۔آسمان کا چاند بادلوں میں کہیں کھو گیا تھا۔انجم کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

اور جب خاکی وردی والے نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی جانب دیکھ کر کہا...... میں تمہیں بدبو پھیلانے کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔

تو اچانک وہ ٹھٹھا کر ہنس پڑا۔اور ہنستا چلا گیا۔

’’چوپ......‘‘

اس کی بلاوجہ ہنسی دیکھ کر دونوں غصے سے چیخ پڑے۔اور دفعتاً وہ خاموش ہوگیا۔

اُن میں سے ایک اُسے چند لمحوں تک دیکھتا رہا پھر بولا۔

’’تم جیسے لوفر لڑکوں کے لئے سالی رات بھر ڈیوٹی دینی پڑتی ہے—اچکے سالے نکمے دو کوڑی کے لڑکے......قانون سے مقابلے کی سوجھی ہے—بول کون کون ہے تمہارے ساتھ۔‘‘

وہ چپ رہا اور بے خیالی میں کھویا رہا۔

اور کون کون ہے تمہارے ساتھ۔؟‘‘ سوال پھر داغا گیا۔

اُس کی خاموشی برقرار رہی۔

دوسرے والے نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

’’ٹھیک ہے......ابھی تو میں تمہیں لاک اپ میں بند کر دے رہا ہوں مگر کل میں دوبارہ آؤں گا...... تمہیں سبق دینے......تمہارے دوستوں کو سبق سکھانے......کہ

قانون کے ہنٹر کافی طاقت ور ہوا کرتے ہیں۔ یہ بتانے کہ حکومت مذاق نہیں ہے۔ کھیل نہیں ہے۔گڈے گڑیوں کا تماشہ نہیں ہے۔ جوتم جیسے پنٹ جاہل بچوں کی سمجھ میں آسکے......'

دوسرا پھر دہاڑا—'بے روزگاری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حکومت سے ٹکر لینے لگو......اس کے خلاف ہو جاؤ...... یہ بدبو تمہارے ہی جیسے لوگوں کی وجہ سے ہے ......تمہارے ہی جیسے لوگوں کی پھیلائی ہوئی گندگی کی وجہ سے ہے۔گندی ذہنیت اور گندی سوچ کی وجہ سے ہے......اور جس کا شکار آج سب کو ہونا پڑ رہا ہے......''

وہ چپ ہوا تو انجم کو اپنی ہنسی پر قابو پانا ایک بار پھر مشکل ہو گیا— اُسے ان لوگوں کی کم علمی پر رحم آ رہا تھا......اُس کے دل میں آیا کہ کہے اے میرے بھائی! سوچنے سے پہلے غور بھی تو کیا کرو کہ تم کیا کہہ رہے ہو......کتنا بڑا جھوٹ اُگل رہے ہو ......کس قدر شرمناک تہمت دھر رہے ہو......بس یہی خرابی ہے تم لوگوں میں......خود ہی سوال کرتے ہو اور خود ہی جواب بھی بن کر کھڑے ہو جاتے ہو......اگر ہمارے چہروں پر سچ کی چنگاری سلگتی ہے تو تم اُس پر بے روزگاری کی مہر لگاتے ہو...... یہ کہاں کا انصاف ہے میرے دوست، میرے بزرگ! اور اگر تمہاری اس بات کو قبول کر لیا جائے تو۔کہو گے ......کمپٹیشن میں بیٹھو اخبارات دیکھو۔نوکری کے سوسو اشتہارات روزانہ نکلتے ہیں ......لائبریریوں میں جاؤ ......درخواستیں دو......کہیں نہ کہیں تو کوئی گوٹی ضرور فٹ ہو جاؤ گی۔اور تمہاری بے روزگاری کا خاتمہ ہو جائے گا......مگر تم ہی کہو...... ملک کے سارے دماغ آئی۔اے۔اس کے دماغ کہاں ہوتے ہیں۔ کمپٹیشن کا سامنا ایک مڈل کلاس طبقہ نہیں کرسکتا۔جو اپنے باپ کی ایماندارانہ کمائی کے بل پر زندہ ہے۔کمپٹیشن دیتے ہوئے عمر ختم ہو جاتی ہے۔سالہا سال بیت جاتے ہیں اور تھک ہار کر مجرم بن کر کسی بھی اندھے کنویں میں چھلانگ لگانا پڑ جاتا ہے۔اور ایسے

ہزاروں رُخ ہیں میرے دوست! کہ جب یہ زبان چلے گی تو کاٹ ڈالی جائے گی......

ہاں...... یہ کہہ سکتے......کہ یہ بدبو ہمارے فالج زدہ احساس کی بدولت ہے ......اسے پھیلنے میں صدیاں لگتی ہیں......

ہم بہت دیر میں جاگے......

ہم مدتوں سوئے رہے......

مگر اب جاگ تو گئے ہیں......اور جب جاگ گئے ہیں اور تمہاری آواز میں تیز بدبو محسوس کر رہے ہیں تو چپ کیسے رہیں گے......ہم اشارہ کریں گے...... بتائیں گے۔ بے حسی برقرار رہے گی تو چیخیں گے چلائیں گے......اور تم تہمت دھرنے کی کوشش کرو گے تو......

ہم آواز بلند کریں گے کہ جو ہماری صداؤں پر پہرہ بیٹھا تا ہو۔ ہماری حفاظت نہیں کرسکتا۔وہ شہنشاہیت کے اس تخت سے نیچے اُتر جائے......

اور ایسے کتنے ہی خیالات تھے......جوان طوطوں کے سامنے بیان کرنا ٹھیک نہ تھا۔انجم چپ رہا......سب کچھ محسوس کرتے ہوئے بھی چپ رہا......ان لوگوں کے سامنے خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

اندر کتنے زخم بہہ گئے تھے......

اور اُسے امت یاد آ رہا تھا......

امت......جو کہا کرتا تھا......

''دوست! اپنے زخم کسی کو مت دکھانا۔

اپنے پاس سنبھال کر رکھنا......

کہ یہ زخم صرف تمہارے ہیں یا تمہارے جیسوں کے......

دوسرا ان زخموں کو۔

بندوق کی گولی سمجھ کر تمہارا دشمن بن جائے گا......''

وقت کب ٹھہرتا ہے جو ٹھہرتا......

دوسرے دن اچانک جیلر نے اطلاع دی...... ایک لڑکی تم سے ملنے آئی ہے— اور اس سے پہلے کہ وہ جاگتا— دو بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں اُسے دیکھ رہی تھیں......

''نمیتا تم......؟''

وہ حیرت سے بولا۔

نمیتا نے نظریں نیچی کر لیں۔

''یہ بتانے آئی ہوں کہ تمہارا مشن بند نہیں ہے۔ امت بھیا کے ساتھ ساتھ اب میں بھی میدان میں آ گئی ہوں۔''

سلاخوں کے باہر سے جیسے دو خوبصورت ہاتھوں نے اُسے سہارا دینے کی کوشش کی......

''مگر تم آئی کیسے......''

میں نے کہا...... میرا بھائی پاگل ہو گیا ہے اُس سے ملنے آئی ہوں'

اس نے نظریں چرا لیں......

'یہاں کون پاگل نہیں ہے انجم...... بدبو نے سب کو پاگل بنا دیا ہے...... یہ جنگ میری بھی ہے...... میرے اسکول کے تمام لڑکے لڑکیوں نے اس کے خلاف ہڑتال کر دی ہے۔ اسکول کالج بند ہو گئے ہیں...... یہ جنگ ہم خراب تعلیم کے خلاف بھی لڑ رہے ہیں— نصابوں میں جھوٹ بھر دیا گیا ہے— تاریخ مسخ کر دی گئی ہے...... یہ اعلان جنگ اس کے لئے بھی ہے......''

اس نے نمیتا کو دیکھا...... بڑے غور سے دیکھا...... بڑے عجیب انداز میں

دیکھا...... اور سوچا...... اُسے پتہ بھی نہ چلا...... چھوٹی سی فراک اور نیکر پہن کر اسکول جانے والی نمیتا...... اپنے اسکول کے آخری سال میں کتنی بڑی ہو گئی ہے...... کتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہے...... وہ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اور نمیتا کہہ رہی تھی۔

تم گھبرانا مت انجم......

ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔''

پھر نمیتا نے نظریں چرا لیں...... ''کریم چاچا بھی اچھے ہیں— اب محلے کی مسجد کے پیش امام ہو گئے ہیں۔''

''کیا؟'' وہ چونک گیا۔

''ہاں'' نمیتا نے نظریں نیچی کئے ہوئے ہی جواب دیا۔ انہیں آفس سے نکال دیا گیا ہے۔''

امت نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ چہرہ لال سرخ ہو گیا۔

''میں پھر آؤں گی......''

نمیتا نے بہت آہستہ سے کہا...... اور برابر آتی رہوں گی۔

''ہاں آتے رہنا۔''

انجم اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

آج ان چھوٹے چھوٹے نازک قدموں نے کتنا بڑا کام اپنے سر لے لیا ہے— مجھے تم پر فخر ہے نمیتا...... آج میں تم کو ایک بالکل نئے چہرے میں دیکھ رہا ہوں...... اور ایک نئی نمیتا میرے اندر جنم لے رہی ہے۔

حیرت ہے...... میں تم کو آج تک نہیں سمجھ سکا۔

تم میرے قریب بیٹھی بیٹھی...... سلگتی ہوئی چنگاری کو لے کر دیکھتے دیکھتے کتنی بڑی ہو گئی......

باب پنجم

عذاب

(۱)

بدبو کم ہو گئی تھی۔ لیکن سوچنے کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ بدبو کا سیلاب تھم ضرور گیا ہے لیکن وہ کسی وقت بھی اپنا باندھ توڑ سکتا ہے ...... مگر اس کے باوجود اطمینان تھا کہ دفاعی تدبیروں نے اور سہنے کی قوتوں نے بدبو کے اثرات کو ختم تو نہیں مگر کم ضرور کر دیا تھا...... مگر یہ کون سوچ سکتا تھا کہ اچانک ...... بالکل اچانک ...... بدبو کا ایک سیلاب پھر سے آ جائے گا ...... ایک ایسا سیلاب جو اُن کے تصور میں بھی نہ ہو گا ...... ہاں جس کے بارے میں پرانی کتابوں میں تذکرہ ضرور ہوا ہو گا ......

کہ ایک دن آئے گا......

جب تمہارے ہونٹوں سے نکلے ہوئے شور بدبودار بھبکے بن جائیں گے ...... پس یہ چاروں طرف سے، تم سے لپٹ جائیں گے۔

اور تمہاری چھوڑی ہوئی ایک ایک بدبودار سانسیں جو عرصہ دراز سے خلاء میں جمع ہو رہی ہیں، تم پر اُلٹ دی جائیں گی...... اور تب تم ان کا سامنا نہ کر سکو گے۔

لوگ آسمانی کتابوں کو یاد کر رہے تھے...... کہ بدبو نے سب کو اپنی حراست میں لے لیا تھا۔ بدبو پھر لوٹ آئی تھی۔

اور سب کو لگ رہا تھا—اب موت یقینی ہے......

بدبو کی شکل میں ایک عذاب آیا ہے...... اور جیسا کہ دوسری قوموں کو زوال آیا—اور وہ قومیں شر، فتنہ اور فساد کی رو میں بہہ گئیں—ویسے ہی ان کا بھی زوال قریب ہے......

شاہراہوں پر بھاگم بھاگ تھی ...... ہنگامہ تھا۔ ریڈیو مسلسل چیخے جا رہے

تھے......اوران ساری باتوں کا نتیجہ بس یہی تھا کہ اطمینان رکھیں......اپنے دفاتر، اپنے
کام نہ چھوڑیں ۔تعلیم گاہوں میں اپنے بچوں کو بھیجیں ۔ ہمیشہ کی طرح مشغول
رہیں......ہم نے جیسے کل بدبو پر قابو پالیا تھا۔اور عادی ہو گئے تھے۔ ویسا ہی اس بار
بھی ہوگا......

لوگوں کے چہرے سکڑ گئے تھے۔ بدبو کی لہر سارے جسم میں دوڑ رہی تھی ۔
خطرے کا سائرن سارے شہر میں بج رہا تھا......حکومت نے دفاعی اقدام بہت جلد کر
لئے...... ہزاروں لاکھوں پیکٹ آن کی آن میں گھر گھر تقسیم ہو گئے ...... بڑے بڑے
ٹینکر اور گاڑیوں سے شہر کے ان تمام مقامات پر جہاں گندگیاں جمع تھیں، ہٹالی
گئیں...... اور سارے شہر میں یہ اعلان کر دیا گیا ...... کہ ڈرنے اور گھبرانے کی
ضرورت نہیں ہے......

حکومت ایسے تمام لوگوں کو خبردار کرتی ہے کہ وہ اپنے گھروں سے باہر کوئی گلی
سڑی گندی چیزیں نہ پھینکیں—— جہاں تک ہو سکے، ہوشیاری سے کام لیں ۔ایسی گلی
سڑی گندی چیزوں کو خود ہی ضائع کرنے کے انتظامات کریں ۔ جیسے اُن میں آگ
لگادیں۔ زیادہ تعداد میں ان پر بدبو مار دوائیاں چھڑک دیں......وغیرہ وغیرہ......

جنگلی جانوروں اور پرندوں میں بھی ہیبت چھا گئی تھی......عجب افراتفری تھی
......وہ سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔کیسی مہک ہے......کہاں جائیں......
پاگل اور وحشیوں کی طرح شور کرتے ادھر اُدھر جھنڈ کے ساتھ دوڑتے دکھائی دے
رہے تھے۔ کتنے ہی دم گھٹ جانے کی وجہ سے زمین پر بچھ گئے تھے......غرض ایک حشر
برپا تھا......اور عذاب میں گرفتار آنکھیں سوچ رہی تھیں ۔

کیا انہیں ایک اور زندگی بھیک میں نہیں مل سکے گی ۔؟

کیا انہیں سدھرنے کا ایک اور موقع نہیں مل سکے گا......؟

ایسے موقعوں پر دعائیں جاگ گئی تھیں——......الفاظ کو بخوبی یہ پتہ ہوتا ہے
کہ وہ کتنے کھوکھلے ہیں ۔ایک موقع انہیں اور دے دیا گیا تو پھر وہ سب کچھ بھول کر
سات روزہ گناہوں میں پھر ڈوب جائیں گے......

کہ کیا تمہیں پتہ نہیں اُن دوسری قوموں کے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا۔ جب
ان پر عذاب الٹا گیا تو وہ حق حق پکارنے لگے اور اس سے رحموں کی فریاد کرنے لگے
جس پر ٹھٹھا کیا کرتے تھے!؟''

بڑا عجیب وقت تھا اور بہت تعجب خیز منظر......لوگ گندگیاں جمع کر رہے
تھے......اور دوڑ دوڑ کر اُن میں آگ لگاتے ہوئے چل رہے تھے۔ان میں وہ بھی تھے
گندگیوں کے بارے میں جانتے بھی نہ تھے۔ بے شکن لباس پہنے موٹروں میں گھوما
کرتے تھے......ان کے احساس یخ ہو گئے تھے اور آنکھوں میں ٹمٹمائی ہوئی امید جل
رہی تھی ۔

دماغ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتوں سے بے بہرہ ہو چکا تھا ۔ نیندیں
غائب ہو چکی تھیں......مگر ان تمام تر تدابیر کے باوجود سیلاب بڑھتا جا رہا تھا۔شہر کے
دوسرے باقی بچے علاقوں کو بھی اپنی گرفت میں لئے جا رہا تھا۔آسمان بھی جیسے بدبو کی
بارش کر رہا تھا—— زمین جیسے فصلوں کی جگہ بدبو اگا رہی تھی ۔

اور جس وقت شہر اس تیز بدبو کا ماتم کر رہا تھا۔اُسی وقت آفس میں ایک
بالکل نیا تماشہ جنم لے رہا تھا۔

تین چار روز قبل کی بات ہے جب پہلی بار مسز بھٹناگر آفس سے غائب
رہی—— نہیں آنے کی بہت ساری وجوہات ہو سکتی تھیں......کوئی کام نکل آیا ہوگا۔ بیمار
پڑ گئی ہوں گی...... یا کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے؟ مس نیلی کا زخم ابھی تازہ تازہ تھا۔اس

لئے بے قراری کا دھواں آفس کے تمام لوگوں میں بھر گیا تھا۔

سب سے زیادہ غصے میں رگھو بیر تھا۔ ورما، اسلم وغیرہ خون کے گھونٹ پی کر صبر کئے ہوئے تھے۔

رگھو بیر کو غم تھا کہ اس کا پارٹنر چلا گیا۔ وہ جیسا بھی تھا اُن کے دکھوں کا ساتھی تھا۔ کیسے کیسے نیک مشورے بروقت دے کر اُس نے لوگوں کی جان بچائی تھی...... اب وہ کریم بیگ کی غیر موجودگی میں خود کو بہت کمزور محسوس کر رہا تھا...... پھر سوچتا، اب یہ کمزوری خود سے الگ کرنی ہی ہوگی ...... آخر آفس میں اتنے سارے دوسرے دوست جو ہیں۔ اور وہ دوست بھی درندے کی صورت پہچان چکے ہیں۔

ان میں رتھ بھی تھا۔ جو رشتے کی پاکیزگی اور اُس کی حرمت سے ہی انکار کرتا تھا۔ مگر واقعات نے کچھ اس طرح کے موڑ دیئے تھے کہ وہ اپنی دنیا کا تنہا آدم بن چکا تھا۔ بس ایک دن کی بات۔ جب پولیس کسی مجرم کو تلاش کرتے کرتے اُس کے گھر میں گھس آئی تھی —— اور اُس کی اکیلی بہن پر تنہائی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ رتھ جیسے آسمان سے گر کر زخمی ہو گیا تھا۔ بلند خیالات جیسے شیش محل کی طرح ڈھا گئے...... اپنا کھوکھلا چہرہ لے کر کوئی کب تک جی سکتا ہے...... ہنس مکھ اور زندہ دل رتھ اپنی ساری ہنسی بھول گیا...... اور سنجیدگی کا بالکل نیا چہرہ لئے ہر دم کھویا کھویا۔ رہتا...... یہی حال سموئیل کا تھا...... رتھ کے حشر نے سموئیل کو بھی اندر سے زخمی کر دیا تھا...... دونوں کبھی گفتگو سے بدبو پھیلانے کا کام آفس کی عمارت میں انجام دیا کرتے تھے...... مگر شاید انہیں بھی اب زندگی کے خطرے کا احساس ہو گیا تھا...... تبھی تو دونوں جیسے ایک دم سے گونگے ہو گئے تھے۔

اور صاحب محسوس کر رہے تھے ...... کہ اس خاموشی کے پس پردہ ایک بغاوت پل رہی ہے ...... یہ خاموشی کسی وقت بھی پھٹ سکتی ہے ...... کسی وقت بھی

آگ بن کر انہیں جلا سکتی ہے...... وقتی طور پر اُن کے اندر بکھراؤ ضرور پیدا تھا۔ مگر ہمیشہ کی طرح اپنی مستقل مزاجی اور خود اعتمادی کے سہارے انہوں نے ماحول پر قابو پا لیا تھا۔ وہ کتنے مضبوط ہیں...... وہ بخوبی جانتے تھے...... اور یہ بھی جان رہے تھے کہ یہ آنکھیں جس کو دیکھیں گی، اسیر کر لیں گی...... ان کو ان آنکھوں کے تیور پر ناز تھا...... دولت پر ناز تھا...... کہ جس کو چاہے خرید سکتے ہیں...... اپنی قوت اور قانون پر بھروسہ تھا کہ جس کو چاہتے برسوں جیل کی چکی پسوا سکتے تھے...... شہر کے تمام بڑے حاکم ان کے دوست یار تھے۔

پھر انہیں ڈر ہی کیا تھا۔ ڈائیل گھمایا اور مسئلے کا حل موجود۔

اس لئے وہ اُمید سے تھے۔

مگر —— رگھو بیر کی آنکھوں میں اب اُمید کی جوت بجھ چکی تھی۔ وہ جان رہا تھا۔ کہیں یہ درندہ مسز بھٹنا گر کو بھی نہ کھا گیا ہو...... اگلا شکار مسز بھٹنا گر بھی ہو سکتی ہیں۔ ...... رگھو بیر کا خون کھول گیا تھا...... یہ لوگ صرف زندگیوں سے کھیلنا جانتے ہیں۔ اور کھیلنے کے بعد ان کھلونوں کو توڑ دینا اپنا فرص سمجھتے ہیں...... ان کے قد اور ہاتھوں کی طاقت بڑھتی جا رہی ہے...... اور اس سے پہلے کہ یہ ہاتھ انہیں بھی کھلونوں کی طرح آگے بڑھ کر توڑ دیں، ان ہاتھوں کے خلاف آواز اٹھانا چاہئے...... ان ہاتھوں کو آگے بڑھ کر توڑ دینا چاہئے......

کچھ یہی خیالات تھے، جو صرف رگھو بیر ہی نہیں بلکہ بہتوں کے اندر داخل ہو گئے تھے...... آنکھوں آنکھوں میں زبانی اشارے ہوئے۔ اور پر اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا گیا...... کہ اب وہ وقت نہیں ہے جب ہم سب کچھ دیکھتے ہوئے زہر پی جائیں...... اور بس دیکھتے رہیں...... تماشہ کب سے دیکھتے آرہے ہیں......

اس لئے جب دوسرے روم بھی مسز بھٹنا گر نہیں آئیں......اور تیسرے روز بھی ان کی غیر حاضری برقرار رہی تو یہ خوف خطرناک صورت اختیار کر گیا......ان آنکھوں میں اچانک وہی درندہ اُتر آیا جو کبھی صاحب کی آنکھوں میں موجود ہوا کرتا تھا۔اس بیچ یہ بھی خبر ملی کہ مسز بھٹنا گر اس درمیان گھر سے بھی غائب رہیں......فلیٹ خالی ہے......اور وہاں تالہ جھول رہا ہے۔

یہ خبر ایک آگ تھی۔اور یہ آگ سب کے دلوں میں اچانک سلگ اٹھی تھی۔

کچھ لوگوں نے جب صاحب سے یہ امر دریافت کرنا چاہا تو صاحب مسکرا کر بہانا بنا گئے......کہ بھائی......وہ میری بیوی تو ہے نہیں......کہ میں اُس کے ایک ایک پل کا حساب رکھوں......وہ کیا کرتی ہے کہاں جاتی ہے؟ کیا کھاتی ہے......وغیرہ......وہ تمہاری ہی طرح آفس کی ایک ممبر ہے......میں نے رحم کھا کر فلیٹ دے دیا۔باقی باتیں میں کیا جانوں؟''

صاحب نے کتنی آسانی سے بات ٹال دیا......یہ احساس سب کو تھا—

صاحب کی اس مسکراہٹ سے نفرت کا سیال ان کے اندر داخل ہو گیا تھا۔اور چوتھے روز جب تمام شہر بدبو میں گھر گیا تھا۔شہر میں افراتفری مچ گئی تھی۔ایک بالکل نیا ڈرامہ آفس کمپاؤنڈ میں شروع ہو گیا تھا۔

دس بجے سے ذرا قبل آفس سیلاب کی پاگل لہروں پر ڈول رہا تھا۔آفس سے لے کر سڑک تک لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ایک تو بدبو کا ریلا دوسرے غم و غصہ میں بپھرے ہوئے لوگ......آنکھیں غصہ میں کھولتی ہوئیں......مٹھیاں سخت—شور آسمان کے پردے پھاڑ رہے تھے......

یہ انقلاب کی نئی کروٹ تھی۔دفتر کے لوگ پاگل ہو گئے تھے کبھی کبھار پاگل آوارہ لہروں پر کوئی آواز صاف صاف سنائی پڑ جاتی......جس کا مفہوم بس اتنا ہوتا......

مسز بھٹنا گر کا پتہ بتاؤ......

اب تم ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتے......

زیادہ ہشیار نہیں بنو......

اب اس معاملے کو ہم نہیں چھوڑیں گے۔''

پھر ملی جلی آوازوں کا سیلاب آ جاتا......اچانک تیز ہارن گونجا—باس کی بڑی سی کار بھیڑ کے چھٹنے اور راستہ کے بننے کا انتظار کر رہی تھی۔

صاحب بھیڑ دیکھتے ہی سمجھ گئے......آج پھر ان گدھوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے......پھر کچھ دانے چھینٹنے پڑ جائیں گے......انہیں خود پر پورا اعتماد تھا......کہ جو بادل گرجتے ہیں وہ برس ہی نہیں سکتے—اور وہ۔اور ان کی آنکھیں ان چیختے دہاڑتے لوگوں کو کمزور کرنے کی قوت رکھتی ہیں......

لوگوں نے راستہ دے دیا اور صاحب کی کار آفس میں داخل ہو گئی......

صاحب سائڈ کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔

وہ بے حد پرسکون تھے......چہرے پر ایک بھی شکن نہ تھی۔غصے میں بھرے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر دھیرے سے مسکرائے......اور نرمی سے بولے۔

''جو کچھ کہنا ہو—میرے کمرے میں آ کر کہو......

صاحب دھڑ دھڑاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔انہیں مکمل یقین تھا۔یہ کمزور گیدڑ اُن کے کمرے تک آنے کی ہمت نہیں کر سکتے......پھر وہ کمرے میں داخل ہو کر ذرا دیر سکون کی سانس لیں گے......پھر ٹیلی فون کا نمبر ڈائل کریں گے......سوکھی روٹیاں ڈالیں گے۔پولیس آئے گی اور معاملہ ختم۔

وہ مسرور تھے۔مس نیلی کی طرح اس بار بھی انہیں اپنی کامیابی کا پورا پورا یقین تھا۔

باہر شور اور چیخ کے بادل اب بھی اٹھ رہے تھے...... جیسے سارے شہر کے لوگوں کی آواز ان میں شامل ہوگئی ہو...... اور سب نے اپنی اپنی کمزوریاں اُتار پھینکی ہوں...... جھوٹے دلاسے کی حقیقت کا علم سب کو ہوگیا ہو...... اور ادھر بدبو پھیل رہی تھی اور اُدھر انقلاب کی کروٹ شروع ہوگئی تھی۔

صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ بے حد سکون کے ساتھ دروازہ بند کیا...... ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گئے...... سکون کی سانس چھوڑی...... پھر ٹیلی فون کی طرف نظر ڈالی۔ اور ہمیشہ کی طرح نمبر ڈائل کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ ہاتھ کانپ گئے ......ایک برقی لہر سارے جسم میں پھیلتی چلی گئی...... وہ چونک اٹھے...... آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔

انہوں نے سوچا بھی نہ تھا—— غور بھی نہیں کیا تھا۔ سب کچھ خلاف توقع تھا......

ان کا دروازہ اچانک ہزاروں دستکوں سے چیخ اٹھا۔ جنگ کے بگل کی طرح......

وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگے...... ہزاروں تھاپوں کے بوجھ سے دروازہ اس طرح چڑمڑا رہا تھا جیسے اب ٹوٹا اور تب ٹوٹا—— چنگھاڑتی ہوئی آوازوں نے ریوالونگ چیئر پر بیٹھے اُن کے وجود کو سرد کر دیا تھا۔

وہ اس انقلاب کے بارے میں سوچ نہیں سکے تھے—— تھکے ہوئے بوجھل قدموں کے ساتھ آگے بڑھے اور دروازہ کھول دیا۔

پھر ہزاروں لوگ کودتے پھاندتے، غصے میں چیختے چلاتے اندر داخل ہو گئے...... سب کے چہرے آگ کی طرح سلگ رہے تھے۔ آنکھیں لہو اگل رہی تھیں۔

اور......

انقلاب کی اس نئی کروٹ سے وہ ابھی تک واقف نہیں ہوئے تھے......

(۲)

بدبو کا سیلاب بڑھتا جا رہا تھا۔

موت کو اتنے قریب سے دیکھ کر ایک لرزہ دینے والا خوف لوگوں کے دلوں میں سرایت کر گیا تھا۔ وہ اتنے خوفزدہ آج سے قبل کبھی نہ تھے۔ اُن کے حواس نے جیسے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ سڑکوں، شاہراہوں پر لوگوں کا زبردست مجمع لگا رہتا...... حکومت کی نااہلی اور ناکارے پن کی کہانیاں سنائی جاتیں—— مخالف پارٹی والوں کے شور الگ فتنہ فساد کھڑا کئے ہوئے تھے...... کوئی وقت ایسا نہ ہوتا جب شاہراہوں سے غصے میں بھرا ہوا جلوس نہ نکلتا ہو، جلوس میں سارا شہر سمٹ آتا...... آسمان جوشیلے نعروں سے گونج اٹھتا—— بے چاری پبلک تو بیوقوف ہوا کرتی ہے۔ وہ کانوں اور آنکھوں پر دماغ سے زیادہ بھروسہ کرتی ہے۔ تباہی و بربادی کی خبریں آرہی تھیں۔ اور سڑکوں پر حکومت کے پتلے پھونکے رہے تھے—— ایک جگہ سے خبر آئی۔'' پولیس کی انتقامی کارروائی نے سیکڑوں مجرموں سے ان کی آنکھیں چھین لیں۔'' شہری حقوق میں رد و بدل کی زبردست ضرورت محسوس کی جارہی ہے...... پریس کی آزادی پر پابندی لگادی گئی ہے......'' اپنے ملک میں لگی ہوئی آگ کا حکومت پر کوئی اثر نہیں—— حکومت دوسرے ملک میں لگی آگ بجھانے میں نمایاں رول انجام دے رہی ہے......''

لوگ باغی ہو رہے تھے۔ ملک کی زمین نئے انقلاب کو محسوس کر رہی تھی—— ایک بار پھر بڑے پیمانے پر ستیہ گرہ کا اعلان ہو رہا تھا۔ ملک سے ایسے لوگوں کا گروہ کھڑا ہو گیا تھا جو صاف ستھری سیاست پر زور دے رہا تھا۔

اس طرح کا ایک ہلکا سا اشتہار آپ ملاحظہ کیجئے۔

بدبو کے خلاف جنگ میں ہمارا ساتھ دیجئے۔

ہمارے رہنما رشوت خوری اور برائی کے راستے پر چل رہے ہیں۔ سونے کی چڑیا کہلانے والا ملک قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں رہ گئی ہے۔ بھروسہ مٹ چکا ہے۔ سماج اور معاشرہ ٹکڑوں میں تقسیم ہے۔ چاروں طرف آگ لگی ہے۔ رشتے بازار میں کھو گئے ہیں۔ تہذیب کے پرزے بکھر گئے ہیں۔ اور اسی لئے مہاماری کی شکل میں بدبو ملک میں پھیلی جا رہی ہے۔

اس بدبو کو دور بھگانے میں ہماری مدد کیجئے۔ خدا کے بھیجے گئے اس عذاب سے باہر نکلنا ضروری ہو گیا ہے — حکومت ناکارہ ہے اور اس لئے — اب آپ کو سامنے آنا ہوگا —''

تو یہ سب ہو رہا تھا کہ آنکھیں کھلنے کے بعد طلسم ہوشربا کا شہزادہ ہاتھ میں ننگی تلوار لئے سامنے کھڑے دیو کو بخوبی دیکھ رہا تھا۔ اور وہ اب اُس کے ساتھ جنگ کے لئے بالکل تیار ہو چکا تھا۔

اور اِدھر —

وہ مذہبی عبادت گاہیں جو ابھی تک سنسان اور ویران پڑی تھیں۔ اب اُن میں بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ مسجدوں سے اللہ ہو اکبر کی تیز صدائیں گونجا کرتیں۔ جو اپنے اپنے بڑے بڑے فلسفوں کے درمیان مذہب سے بالکل ہی کٹ چکے تھے اب پابندی وقت سے وضو کرتے اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے نظر آتے۔ زندگی میں جب بھی بکھراؤ آیا ہے۔ یہ بکھراؤ مذہب نے ہی کم کیا ہے۔ مندروں کے گھنٹے ہر وقت بجتے رہتے۔ رادھا کرشن کے بھجن ہر طرف ہو رہے تھے۔ کہیں جپ کیا جا رہا ہوتا۔ گوردوارے اور اس طرح کے دوسری مذہبی مقامات پر ماننے والوں کا زبردست مجمع دکھائی دیتا۔ مذہبی رہنما اپنی اپنی قوم کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے

نظر آئے۔

کہ اے لوگو......!

اُس سے ڈرو...... پناہ مانگو...... جو چاہے تو تم پر پتھروں کی بارش کر دے۔

تم اپنے گناہوں کے لئے رو رو کر معافی مانگو...... ہاتھ پھیلاؤ کہ بدبو کا عذاب فقط اُس کی دین ہے۔

تمہاری آج تک اچھالی گئی چیخوں کا سبب ہے......

تمہاری سوئی ہوئی آنکھوں کا عذاب ہے......

لوٹو......

لوٹو اس کی طرف

کہ ایک دن تمہیں اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔

یہ دنیا محض آخرت کے لئے ایک زادِ راہ ہے...... تاکہ اچھا کرو...... نیک اعمال ہو گا تو نیک پھل ملے گا اور آخرت میں ایک ابدی محل کی بنیاد پڑ سکے گی...... اس لئے اس کی اطاعت کرو۔ پیروی کرو...... کہ وہی سب سے بڑا بادشاہ ہے......

اور ایک طرف دعائیں، فرشتے ہتھیلیوں پر لئے عرش بریں کی طرف اڑتے جا رہے تھے اور دوسری طرف شاہراہوں پر نفرت اور غصے کا پتھراؤ چل رہا تھا......

اور حکومت ان معاملات میں چپ نہیں تھی۔ اُس نے ایسے اشخاص کی۔ جو حکومت کے معاملے میں دخل اندازی کر رہے تھے، اس کے کام کی رکاوٹ بن رہے تھے۔ گرفتاری کا حکم جاری کر دیا تھا— بے دھڑک گولی مارنے کی یہاں تک کی سزائے موت کا اعلان بھی کیا جا چکا تھا۔

یہ خبر نہیں ایک آگ تھی۔

بدبو کا عذاب ہی کیا کم تھا...... اس خبر نے لوگوں کو بہت زیادہ بھڑکا دیا تھا۔

انقلاب کے لئے جس چھوٹی سی چنگاری کی ضرورت تھی وہ وہ شاید حکومت نے مہیا کر
دی تھی ۔ بے چینی لوگوں میں پیدا ہو رہی تھی ۔ اور جب رہی سہی اُمید بھی ٹوٹنے لگی تو
ان کا غصے میں وحشی ہونا واجب تھا۔

وہ اخبارات جو زہر اگلتے تھے ......حکومت کے خلاف نکتہ چینیاں کرتے
تھے، غلط افواہیں ۔ پھیلانے کے جرم میں مالکوں کی بھی ۔ گرفتاریاں عمل میں آ رہی
تھیں ......کئی جگہوں سے مشتعل عوام پر گولی چلانے کی خبریں بھی موصول ہوئی
تھیں......اور ایسا لگ رہا تھا جیسے......جنگل میں ایک تیز آندھی آ گئی ہے۔

ایسی خوفناک آندھی جنگل میں اس سے پہلے کبھی نہیں اٹھی۔

جنگل لرز رہا ہے......

اور جنگل کے حکمراں شیر کو زخمی کر دیا گیا ہے—

زخمی شیر پاگل ہو گیا ہے......خوفناک ہو گیا ہے۔

وہ سارے جنگل کو روندتا پھرتا ہے۔

مصیبت چاروں طرف سے آیا کرتی ہے......سیاست حاوی تھی— مگر ان
سب کے باوجود لوگ خوفزدہ تھے......بدبو برقرار تھی......

اب ان سارے مسئلوں کا صرف ایک حل نظر آتا تھا......

موت—

صرف موت۔

جنگل کے زخمی شیر کے ڈر سے لوگ کب تک اپنے گھروں میں چھپے رہے
سکتے تھے......ایسے عذابی موسم میں بھی وہ قصے وہ کہانیاں، وہ افسانے ختم نہیں ہوئے
......روزمرہ کے عام واقعات میں کوئی خاص تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی ......اتنے
بکھراؤ کے باوجود سماج میں وہی پرانی کہانیاں بار بار دہرائی جا رہی تھیں......غلطیوں

کے باوجود پرائشچت کی کوشش نہیں کی گئی......کمزوریوں کو ہوا دی گئی......شاید دنیا کا سفر
اسی طرح جاری رہتا ہے—

اپنی خراب طبعیت کے باعث جب کریم بیگ کسی وقت مسجد نہیں پہنچ پاتے
اور نماز کا کوئی وقت ان کے ہاتھ سے نکل جاتا تو نمازی پریشان ہو جاتے۔ پہلے تو ان
کی غیر حاضری کو ان کی بیماری کی وجہ سے نظر انداز کیا گیا— لیکن یہ سلسلہ برقرار رہا تو
محلے کے لوگ ایک ایک کر کے اُن کی مخالفت پر اُتر آئے۔ بدبو کے عذاب سے
نمازیوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا تھا۔ پھر کون چاہتا کہ کسی وقت کی بھی نماز
قضا ہو جائے—جب کریم بیگ کی غیر حاضری کا یہ سلسلہ قائم رہا تو پہلے مسجد میں
محلے کے لوگوں کی ایک بیٹھک ہوئی۔ کچھ مشورہ ہوا......اور پھر سید صاحب کریم بیگ
سے ملنے اُن کے گھر پہنچ گئے۔

پھیلی ہوئی تیز بدبو نے کریم بیگ کے جسم کو کمزور کر دیا تھا۔ نقاہت اس قدر
آ گئی تھی کہ چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ آنکھیں دھنس گئی تھیں۔

اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر کریم بیگ نے حیرت ظاہر کی......اور کمزور
آواز میں بولے......

''بھائی بزرگو! اللہ مجھے معاف کرے......اب چل نہیں ہوتا...... بیٹا جیل
میں چکی پیس رہا ہے......اور یہ آنکھیں اب کمزور ہو گئی ہیں—

''پھر ہم کوئی دوسرا انتظام کر لیں؟''

سید صاحب نے صاف صاف لہجے میں فیصلہ سنا دیا......

کریم بیگ چھن سے رہ گئے......وہ تو تسلی کی امید لئے بیٹھے تھے۔ جسم کے
کمزور حصے پر چاقو سے وار کرنے کی بات تو سوچ بھی نہ پائے تھے......اچانک بہت
کمزور پڑ گئے— پھنسی پھنسی آواز میں بولے۔

"جیسی مرضی آپ لوگوں کی ......اب مجھ سے چل بھی نہیں ہوتا— آگے اللہ مالک۔"

گردن جھک گئی...... ہاتھ جھول گئے......

سید صاحب چلے گئے—

شیخ صاحب چلے گئے—

کریم بیگ سکتے کے عالم میں بستر پر پسر گئے—

(ایک جانور جب ہمارے درمیان سڑ گل جاتا ہے تو کیا ہم اُسے باہر پھینکنے کا انتظام نہیں کر لیتے ؟)

غم تو یہ تھا کہ یہ پہاڑ جیسا بڑھاپا کیسے کٹے گا۔؟ کون سی صورت نکلے گی ؟ بوڑھے کمزور بدن کو کون سہارا دے گا۔؟

کریم بیگ نے ایک ڈوبتی ہوئی سانس لی۔

"اسی نے یہ بوجھ جیسا بڑھاپا دیا ہے۔ وہی انتظام بھی کرے گا"

آسمان سے کتنے ستارے ٹوٹے اور کریم بیگ کی آنکھوں میں داخل ہو گئے ......آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی— رضیہ کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں......

باب ششم

اسپتال

یہاں موت ہی موت ہے
اور زندگی گم ہو گئی ہے

"زندگی کی سچائیاں جاننا چاہتے ہو
تو اسپتال جاؤ ر
یقین جانو۔ وہاں الگ الگ بستروں پر کراہتے سسکتے
اور گھناؤنے مریض کوئی اور نہیں، تم ہو!
یقین جانو۔ نئی تہذیب نے
تمہاری اصلیت چھپا دی ہے۔
ورنہ تم بھی کینسر وارڈ کے چھٹپٹاتے ہوئے مریضوں میں
سے ایک ہو۔"

(۱)

امت ابھی ابھی گھر لوٹا تھا۔ ساری رات کا تھکا ہارا...... رات بھر وہ اِدھر اُدھر اسپتالوں کے چکر لگاتا رہا۔ مریضوں کی بدتر حالت اور اُس سے بھی بدتر اسپتالوں کا انتظام اُس سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ دماغ کی نسیں پھٹ رہی تھیں...... ملک میں کتنی خرابی آ گئی ہے—لوگ باگ اپنی اپنی ڈیوٹی بھول چکے ہیں...... انسانی محبت ان کے درمیان سے عنقاء ہو چکی ہے...... وہ اسپتالوں میں دیکھ آیا تھا۔ ڈاکٹر اور مریض کے بیچ اب کیا رشتہ رہ گیا ہے—نفرت اور حقارت کا رشتہ—امت سوچ رہا تھا—محض نعرے لگانے سے کچھ بھی نہیں ہونے والا...... سوائے اس کے کہ ایک جنگلی جانور کو چھیڑ دیا جائے تو وہ غصے میں الٹا وار کرنے پر تل جاتا ہے...... رات بھر وہ اور اس کے ساتھی مختلف اسپتالوں اور کیمپوں کے چکر لگاتے رہے...... دوائیوں اور فوری ضرورتوں کی تکمیل کرتے رہے...... رات کا ایک حصہ ختم ہوا ہو تو دوست رخصت ہو گئے مگر امت رہ گیا—صبح جب وہ لوٹا تو خاصہ تھک چکا تھا۔ سوچا تھا کہ آدھا ایک گھنٹہ لیٹ کر طبیعت ہلکی کرے گا کہ اچانک اسی وقت کچھ لڑکے ٹپک پڑے۔

امت چپل پہن کر فوراً باہر نکلا۔

''کیا خبر لائے ہو؟''

'' حالت اچھی نہیں ہے دوست۔ مریض بڑھتے جا رہے ہیں۔ حفاظتی کیمپوں اور اسپتالوں میں اب کوئی جگہ نہیں رہ گئی ہے۔''

''اب کیا کیا جائے۔''

''کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔

امت نے کچھ سوچتے ہوئے کہا...... یوں بیٹھے بیٹھے تو کسی مسئلے کا حل نکل نہیں سکتا۔''

''تم رات بھر کے جاگے ہوئے ہو دوست''—ایک لڑکے نے یاد دلاتے ہوئے کہا۔''بس تم ہمیں مشورہ دے دو۔ ہم سنبھال لیں گے''

''نہیں''

امت دھیرے سے مسکرایا۔''میرے جاگنے کی بات چھوڑ دو۔ رات بھر میں کتنے مریض بھگوان کو پیارے ہو گئے، بتا سکتے ہو؟۔ اس لئے ایسے وقت میں جاگنے اور سونے کی بات ہی ختم کر دو۔ سوال ہے اب کیا کیا جائے...... یوں ہاتھ دھرے بیٹھنے سے کچھ ہونے والا نہیں ے۔ اب عمل کی ضرور ہے۔

امت تھوڑا اٹھہرا...... پھر دوستوں کے چہروں کا جائزہ لیتا ہوا بولا......'' تم جانتے ہو محبت میں بڑی قوت ہوتی ہے...... ایک مریض بیمار ہے۔ ہم اُس کے سامنے اگر کڑوی باتیں کرتے ہیں تو اسے رنج پہنچتا ہے اور بیماری مزید بڑھتی ہے۔ مگر اس کے برخلاف ہم اُس کے سامنے محبت کی میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں تو محبت کی یہ فضا مریض کو اچھا کر دیتی ہے...... مریض محبت کھوجتے ہیں—محبت آدھی بیماری غائب کر دیتی ہے۔ اور یہ محبت نہ اسپتالوں میں ملتی ہے۔ نہ ان کے کیمپوں میں بٹتی ہے...... وہاں صرف سخت چہرے نظر آتے ہیں۔ اور ڈیوٹی پوری کرنے والا حاکم دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے......

ہم انہیں محبت دیں گے...... محبت سکھائیں گے...... انہیں حوصلہ دیں گے...... مرض سے لڑنا بتائیں گے...... زندگی کی خوبصورتی سے آگاہ کریں گے...... کہ بیماری کے دوران ان کے درمیان سے زندگی کی خوبصورتی غائب ہو جاتی ہے...... اور موت کا ہولناک سناٹا رہ جاتا ہے...... ہم بتائیں گے کہ یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے......

جینے والے کتنے خوش قسمت ہیں......اور یہ زندگی کتنی خوبصورت شے ہے......آسمان کتنا چمکیلا ہے......زمین کیسی سبز ہے۔ کیسے نیارے نیارے لوگ ہیں۔ کیسے کیسے عجوبے ہیں......ہم انہیں زندگی کی رعنائیوں سے آگاہ کریں گے......ان کی تیمارداری کریں گے۔ اور یہ یقین ہے...... کہ محبت کی اس خوشگوار فضا میں وہ ضرور اچھے ہو جائیں گے——''

امت کی آنکھیں خوشی سے اُبل رہی تھیں......وہ ذرا دیر کو ٹھہرا......پھر ان کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

''دوستو! میرے دماغ میں ایک خیال آیا ہے......خیال تو ناممکن سا ہے ......مگر ہم لگ جائیں گے تو ممکن ہوسکتا ہے۔''

''تم بتاؤ تو سہی۔'' اصغر جوش میں بولا......

''ہم وہ ممکن کر دکھائیں گے——'' پرتپال سنگھ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''محبت کی یہ تعلیم ٹالسٹائی نے بھی دی تھی۔ رانا بولا۔'' اور گاندھی جی نے اسی تعلیم کی روشنی میں اہنسا کا مارگ اپنایا تھا۔ تم حکم کرو......

''ٹھیک ہے۔''

امت دوستوں کا جوش وخروش دیکھ کر بولا...... ''تم سب دوستوں کو لے کر بڑھیا پھاٹک پر جمع ہو۔ میں دس منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ رہا ہوں۔

آسمان سورج نمودار ہو چکا تھا۔ چاروں طرف پر روشنی ہی روشنی پھیل گئی تھی۔

پھر سب دوست ایک دوسرے سے جدا ہو کر اپنے اپنے کاموں میں گم ہوگئے۔ اور آدھا گھنٹہ بعد ۲۵۔۲۰ لڑکوں کا جھنڈ بڑھیا پھاٹک والے میدان میں

سنجیدگی کی مورتی بنا ہوا نئے مشن کے بارے میں غور کر رہا تھا۔

اور امت کہہ رہا تھا۔

دوستو! ذرا سوچو......غور کرو...... یہاں کی فضا بگڑ گئی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم خود کو ان کے حال پر، رحم وکرم پر چھوڑ دیں—— کیا ہمیں صرف انہی پر منحصر رہنا ہوگا۔؟ کیا ہم خود ان کاموں کو انجام نہیں دے سکتے جسے وہ بغیر محبت کے محض ڈیوٹی کے تحت انجام دے رہے ہیں—— ہمارے اندر جوش ہے۔ محبت ہے۔ میل ملاپ ہے۔ اور ان تین چار دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد ان کے وہ ناقص انتظامات بھی ہماری نظروں سے سے اوجھل نہیں ہیں۔ اب کوئی تبصرہ کرنا بیکار ہے۔ اس لئے ہم نے سوچ لیا ہے۔ ہم صرف کام کریں گے......اور کام کریں گے۔

امت نے ٹھہر کر دوستوں سے دریافت کیا......تو تم سب تیار ہو؟''

''ہاں''

مضبوط ہاتھ ہوا میں اٹھ گئے——

'ٹھیک ہے۔ اب وقت برباد کرنا بے کار ہے......ہم سب کو اسی وقت سے کام میں جٹ جانا چاہئے۔ ہم اپنے اپنے کام اس طرح سے بانٹ لیتے ہیں...... آپ میں سے کچھ لوگ میرے ساتھ چلیں گے۔ ہم نے جگہ کے بارے میں غور کر لیا ہے۔ رمنہ میدان میں ہم اپنا الگ ایک حفاظتی خیمہ نصب کریں گے۔ وہاں کی زمین صاف کریں گے اور وہاں اپنے خیمے لگائیں گے......جس سے جو ہوگا......اپنے اپنے گھروں سے چارپائیاں پلنگیں لے آئے گا...... یہ مریضوں کے بستر کے کام آئیں گی۔ کچھ لوگ شہروں میں بٹ جائیں گے...... اور رکشے، ٹیمپو والوں کو مناسب معاوضے پر ٹھیک کر لیں گے۔ ان کا کام ہوگا بدبو کے بیمار مریضوں کو یہاں تک لانا۔ ہمارے خیموں میں داخل کرنا۔ ان مریضوں کے لئے دوڑ دھوپ بھی ہمیں ہی کرنا

ہوگا۔ضرورت پڑنے پر ڈاکٹروں کو بلایا جائے گا — میرے کچھ دوست ڈاکٹر ہیں۔
میں انہیں مدد کے لئے مجبور کروں گا — ہم ان مریضوں کو محبت دیں گے۔حسین زندگی
کے فلسفے کی سیر کرائیں گے۔ اور اُن کے مردہ جسم میں جینے کی امنگیں پیدا کریں
گے......

امت کی آواز کانپ رہی تھی......وہ جیسے ہی خاموش ہوا۔کئی مضبوط ہاتھ ہوا
میں اُٹھ گئے۔''ایسا ہی ہوگا میرے دوست — ایسا ہی ہوگا۔''

''ہم تیار ہیں اور اسی وقت سے اپنا کام شروع کرتے ہیں۔

'اب ہم دوسروں پر بھروسہ نہیں کریں گے۔'

امت کے چہرے پر مسرت سمٹ آئی......آنکھوں میں انجم کی تصویر تھی۔وہ
آہستہ بولا — دوست......ہم تمہارے ہی بتائے گئے راستے پر چل رہے ہیں۔تمہاری
بہت یاد آتی ہے......'

(۲)

یہ ایک بڑا سا کھلا میدان تھا اور یہاں اس وقت کافی چہل پہل اور رونق
دیکھی جا رہی تھی۔نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی جماعت دوڑ دوڑ کر کام میں مصروف
تھی۔گھاس پات کاٹے جا چکے تھے۔کانٹوں کی جھاڑیاں صاف کی جا چکی تھیں۔کئی
خیمے ان میدانوں میں نظر آرہے تھے......ان سے الگ بھی کئی چار پائیاں اور چوکیاں
بھی مختلف جگہوں پر بچھی ہوئی تھیں — دوسری طرف رکشے والوں اور ٹیمپو والوں کی
قطار نظر آرہی تھی —

میدان کے باہر بلوہی زمین دور تک چلی گئی تھی۔کچے پکے مکان اور گمٹیوں
والی متعدد دکانیں دکھائی دے رہی تھیں۔اور ان آنکھوں میں جہاں بے رونقی اور

ویرانی اپنا ڈیرا وقت ڈالے رہتی تھی، اب وہاں سے اطمینان اور سکون جھلک رہا تھا —

چار پائیوں پر کچھ تھکے ہارے جسم ابھی ابھی ستانے بیٹھے تھے — خیموں
میں مریضوں کی لمبی قطار دکھائی دے رہی تھی۔کچھ دوسرے مریض خیموں سے الگ
چوکیوں اور چار پائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

امت کے پور پور سے خوشی کی ترنگیں پھوٹ رہی تھیں۔اس وقت اُس کے
دوستوں کی فوج اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھی۔

''دیکھا سب کے سب کتنے خوش ہیں۔''

امت لہراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔''بدبو محض ایک وہم ہے۔حیرت تو یہ ہے
کہ سب اس نئی بلا سے ڈر کر وہم کے شکار ہوگئے — دراصل یہ بدبو اپنے آپ کی
کمزوری کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔''

ایک مریض نے آہستہ سے کروٹ بدلی۔پھر دھیرے سے کچھ گنگنایا —
امت نے اُس کی جانب دیکھ کر ہاتھ جوڑ دیا۔''پرنام بوڑھے بابا......!''

بوڑھے نے مسکرانے کی ہلکی سی کوشش کی۔

امت دوبارہ بولا......میرے بوڑھے بزرگ! دیکھا نا؟ کیسا وہم بھر دیا تھا
ہم لوگوں میں ان اندھ وشواسی لوگوں نے ......لعنت ہو ان بھیڑیوں پر کہ خواہ مخواہ
سب کو خوفزدہ کر دیا — ذرا پلٹ کر دیکھئے تو......ان تمام آنکھوں میں......جو خیمے میں
لگے بستروں پر۔چوکیوں اور چار پائیوں پر لیٹے نیلے آسمان کی وسعتوں کو دیکھ رہے
ہیں......کیا ان میں بیماری نظر آرہی ہے؟ نہیں نا...... بیماری کوئی چیز نہیں ہے۔جسم
تھک جاتا ہے تو ہم بیماری کہہ دیتے ہیں۔معاشرے کا نظام درہم برہم ہوجائے تو بدبو
کہہ دیتے ہیں۔ظاہری حقیقت ہمیشہ ایک دیگر شے رہی ہے......

اب وہ مسکراتا ہوا پلنگ پر لیٹے ہوئے اس مریض سے خیریت دریافت کر

رہا تھا— اُسے بہلا رہا تھا......دلاسہ دے رہا تھا...... ہاں تو کیا کہتے ہیں بابا......

’فلسفہ......زندگی کا ایک فلسفہ ہے......‘‘بوڑھا ہڈی چمڑا آہستہ سے ہنسا......

’’ہاں فلسفہ ہے...... بڑی ٹیڑی کھیر...... زندگی ہماری تمہاری سمجھ سے باہر......سنو گے......؟‘‘

’’ہاں......‘‘بوڑھے کی آنکھوں میں چمک لہرائی......

پھر امت نے چھوٹے چھوٹے جملے میں اُسے بتایا...... یہ جو آسمان ہے۔ وہ آسمان نہیں ہے— جو زمین ہے وہ زمین نہیں ہے— جو بھوک ہے وہ بھوک نہیں ہے۔

’’تو کیا ہے؟‘‘ بوڑھا مسکرا رہا تھا۔

’’جینا صرف جینا—‘‘ امت قہقہہ لگا کر ہنسا...... یہ سب جینے کی باتیں ہیں......اور جینا کتنا خوشگوار ہوتا ہے......ہم آسمان کا نیلا پن دیکھتے ہی خوش ہو جاتے ہیں۔ پرندے، چرندے، سبزہ، وادیاں دیکھ کر ہمیں مسرت ہوتی ہے۔ ہوتی ہے نا۔ اور سائنس کہتا ہے آسمان دھوکہ ہے......اب بتاؤ ہے تو ہمیں کیا لینا......اچھا لگتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں۔ بھوک لگتی ہے تو کھاتے ہیں......تم بھی کھاؤ گے......؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ بوڑھے کی مسکراہٹ اچانک غائب ہوگئی۔ کچھ تاریک پرچھائیاں اُس کے چہرے پر سمٹ آئیں۔ وہ کئی دنوں سے کچھ کھا پی نہیں رہا تھا۔ اپنے خاندان میں وہ اکیلا بچا تھا۔ بس کچھ ہی دنوں قبل بڑے چھوٹے کے جھگڑوں میں اس کے گاؤں میں آگ لگا دی گئی۔ اور اُس کا گھر بھی اس آگ کا شکار ہو گیا۔ جلے ہوئے لوگ اسپتال پہنچائے گئے۔ اور اسپتال والوں کی بے توجہی نے اُس کے خاندان کے تمام لوگوں کو اُس سے جدا کر دیا اپنی زندگی بھول گیا— اس غم میں وہ خود بھی موت کے منہ میں تھا۔ مگر امت اور اس کے دوست موت کے منہ سے نکال کر اُسے باہر لے آئے تھے۔

جب بڑھے نے کھانے سے انکار کر دیا تو امت اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کے سوکھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے— اُس کے چہرے پر غم ہی غم سمٹ آیا تھا ......آنکھوں میں قدرے آنسو بھرے وہ کہہ رہا تھا......

’’بابا......ہم جینے کے لئے خاندان بناتے ہیں......اپنے آپ کو خوش رکھنے کے لئے —زندگی کافی لمبی ہے ......طویل ہے ...... ایک ایک لمحہ جینے کے لئے پیار اور محبت کی ضرورت پڑتی ہے......جو اپنوں سے‘ اپنی مٹی سے ملتی ہے......دراصل بابا...... ہم سب اکیلے ہیں ...... اکیلے ہی آئے ہیں ......اس لئے زندگی کے آنے جانے کے سلسلے کو بھول کر چپ ہو جاؤ......ایک خاندان نہیں رہا تو تمہیں گھبرانے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے......دیکھو بابا......چاروں طرف کا جائزہ لو......سب مل کر ایک خاندان بن گئے ہیں۔ ایک بڑا خاندان ......کل تک ایسا نہیں تھا مگر ذرا غور سے دیکھو......محبت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ان لوگوں پر رحم کھاؤ......سب بغیر تھکے تمہیں آرام دینے کے لئے، تمہاری محبت پانے کے لئے جئے جا رہے ہیں۔ اس امید پر کہ جب تم اچھے ہو گے تو انہیں پیار دو گے۔ اور یہ تمہاری شفقت کے سائے تلے آگے بڑھیں گے ...... بابا! سب ایک خاندان ہیں ......فرق مٹا تو نہیں مگر مٹ رہا ہے۔ تمہاری ضرورت ہے ......کھا لو...... میری نہیں تو محبت کی بات مان لو......اور کھا لو......

امت کی آواز بھرا گئی— آنکھوں میں آنسو اُتر آئے— اچانک بابا چونک اٹھا......اندر جیسے گرم خون نے ابال مارا ہو......گونگے بہرے جذبات میں ہلچل مچ گئی ......اس نے امت کو دیکھا...... بے پناہ محبت بھری آنکھوں سے دیکھا......پھر ہڈیاں کڑکڑائیں......امت نے آہستہ سے سہارا دیا......اور تازہ رس گلے بابا کے پوپلے منہ کے حوالے کر دیا......

''کون کہہ سکتا ہے محبت مر گئی۔''

بابا آہستہ سے بڑبڑایا—اب وہم مر گے گا...... ہمارے دماغ میں گھسا ہوا وہم مرے گا اور محبت پھر سے زندہ ہوگی۔''

''اب تم لیٹ جاؤ......''

امت نے سہارا دیتے ہوئے بوڑھے کو پھر سے لٹا دیا۔''گھبرانا نہیں۔ میں پھر تمہارے پاس آؤں گا...... خاندان بہت بڑا ہے نا۔ سب کی دیکھ ریکھ کرنی ہے...... بس اچھی طرح سے لیٹے رہنا......

بابا مسکرایا۔ آہستہ سے ہاتھ اوپر کیا— جیسے آشیرواد دے رہا ہو......

پھر امت اپنے دوستوں کے جھنڈ کے ساتھ آگے بڑھ گیا...... بوڑھے سے ذرا دور جا کر وہ اپنے دوستوں سے مخاطب ہوا......

''دیکھا...... انہیں دوا سے زیادہ محبت کی ضرورت تھی۔ جس کا اسپتالوں میں اور حاکم کہلانے والے وردی پوشوں میں فقدان ہے—اس بابا کو دیکھا...... اگر اسے پیار نہ ملتا تو وہ کل تک دم توڑ چکا ہوتا...... اس کا سارا خاندان تباہ ہو گیا۔ پھر بھی پیار اور محبت کے، زندگی دینے والے جملوں نے اس کی جان بچا لی...... اب بس یہی دعا کرنا ہے کہ وہ دن جلد آئے جب ہم سب مل کر ایک خاندان بن جائیں''

''آمین''—اصغر نے آہستہ سے کہا۔

امت اور اُس کے دوست اب دوسرے مریضوں کی طرف بڑھ گئے......

اچانک امت ٹھہر گیا...... یہ ایک نوجوان تھا...... دبلا پتلا ہڈی کا ڈھانچہ۔ بدن سے جیسے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ چہرے پر جذبات کا کوئی رنگ نہیں۔ اس شخص نے آنکھیں بند کئے ہی ان کے قدموں کی آہٹ پہچانی— پھر ویسے ہی آنکھیں بند کئے ذرا زوردار آواز میں بولا۔

''گڈ مارننگ میرے پیارے دوستو!''

''گڈ مارننگ''

سب ایک ساتھ مسکراتے ہوئے بولے۔''آپ اچھے تو ہیں۔''

''ہاں۔ بالکل۔ دیکھ رہے ہو نا؟'' اتنا کہہ کر وہ ایک پھیکی سی ہنسی ہنسا— سب پاس والی خالی چوکی پر بیٹھ گئے۔

وہ شخص پھر بولا......''میرے نوجوان ساتھیو! میں تم لوگوں سے بہت متاثر ہوں۔ اور کل والی تمہاری بات سے بھی۔ یاد ہے کل تم لوگوں نے انسانی حقوق کی بات کی تھی۔ میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تم نے کہا تھا۔ غلطی ہم سے ہوتی گئی اور ہم اپنے حقوق کو بھولتے چلے گئے۔ اور سب کچھ کٹھ پتلی نچانے والے کے حوالے کر دیا اور کٹھ پتلی بن گئے...... کہا تھا نا......؟

''ہاں'' امت کھلکھلایا۔ کہا تو تھا۔ مگر میرے فلاسفر دوست تمہیں کل والی بات اچانک یاد کیسے آ گئی۔

وہ ہنسا......''انسانی حقوق کی بات تھی نا۔ اسی لئے یاد رہ گئی۔ ارسطو نے کہا تھا۔

Man is born free but Everywhere he is in chains

میں کل انہی زنجیروں کے بارے میں سوچ رہا تھا...... پھر اچانک خیال آیا۔ ایک مردہ حقوق کے بارے میں سوچ ہی کیا سکتا ہے۔ اور مردے کا حقوق بھی کیا......''

اچانک وہ چپ ہو گیا۔

امت چونکا اور سب کے سب جیسے گونگے ہو گئے۔

پھر بڑے ڈرامائی انداز میں اس شخص نے اپنی ایک آنکھ کھولی۔ پھر اچانک دوسری۔ ہونٹوں سے ایک تیز سیٹی ماری...... اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا......

''مجھے دیکھو دوستو...... مجھے...... تم ایک مردے کو کل انسانی حقوق کے

بارے میں بتا رہے تھے نا۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں...... ایک مردے کو جس کی بیماری کا علاج کرتے ہوئے ڈاکٹر اس کے پیٹ میں انجکشن بھول آیا تھا۔ اور پھر دوبارہ آپریشن میں اتنا خون ضائع ہو گیا کہ اس بچنے کی اُمید صفر برابر رہ گئی......

'صرف موت کا انتظار ہے دوست۔'

بڑے بہادر بنتے ہو...... بس اتنی سی بات سے ڈر گئے...... بھولنا تو آج بڑی عام بات ہو گئی ہے...... ہم سب اپنا اگلا پچھلا بھولتے جا رہے ہیں۔ تم تو فلاسفر ہو...... سب کچھ جانتے ہو سمجھتے ہو...... سامنے دیکھو میرے دوست — زندگی اتنی سستی نہیں کہ ہم اپنے حقوق کے لئے اپنے جسم کو کمزور چھوڑ دیں — ہمیں جینا ہے اور زندگی کو خوبصورت سمجھ کر جینا ہے...... ایک خاندان بن کر جینا ہے۔ یہ سوچ کر کہ کھلے آسمان پر پابندی لگانے والا کوئی نہیں ہے...... زمین پر چلنے سے روکنے والا کوئی نہیں ہے...... ہم جتنی چاہے سانس لے سکتے ہیں...... اور جب اِن سب پر پہرہ نہیں ہے تو پھر وہ کون ہے۔ پہرہ بٹھانے والا...... وہ کون ہے ہماری زندگی تلخ کرنے والا — میں نے تو حقوق کی صورت میں زنجیریں دیکھی ہی نہیں...... حقوق تو یہ ہونا چاہئے کہ اگر وہ اونچے محلات میں بدبو مار پیکٹ گرائے جائیں اور تمہارا گھر چھوٹ جائے تو تم اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے اپنا گھر دکھاؤ — کہ راستے میں ہمارا گھر بھی پڑتا ہے عزیز...... تم ایک بھائی کا گھر بھولے جاتے ہو اور میرا گھر بھی بدبو سے اتنا ہی پریشان ہے جتنا دوسروں کا...... اس لئے اس پیکٹ پر میرا اتنا ہی حق ہے جتنا دوسروں کا ہے...... اور اس آسمان پر جتنا میرا حق ہے اتنا ہی تمہارا...... اور آسمان کے نیچے والے سارے ایک ہی قبیل کے لوگ ہیں۔ اس لئے حقوق برابر ہیں اور تم یہ کیسا فرق کر رہے ہو......''

امت ہانپ رہا تھا...... مگر تم اتنے سے ہی ڈر گئے میرے دوست — کل کی بات بھول گئے کہ ہمیں ایک خاندان بن کر رہنا ہے۔

اُس شخص کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اس نے ایک تھکی ہوئی سانس لی......

''تم شاید ٹھیک کہتے ہو...... میں واقعی غلط سوچنے لگا تھا۔ زندگی سچ مچ بہت خوبصورت ہے — مگر سامنے کیا ہے؟'

''ایک اور نوجوان — تمہاری طرح — تمہاری طرح ہی تیز رفتار زندگی کے شکار ڈاکٹر کی بھول کا نتیجہ...... ایک نادن ڈاکٹر کا شکار، جو اُس کے مرض کو سمجھ ہی نہیں پایا۔''

امت اُسے تسلیاں دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

سامنے والے خیمے میں بیمار لڑکیوں اور عورتوں کی پلنگیں بچھی ہوئی تھیں...... نوجوان اور سمجھدار لڑکیاں ان کی دیکھ بھال میں مشغول تھیں۔ اچانک اُن میں سے دوڑتی ہوئی ایک لڑکی باہر نکلی اور زور سے بولی...... امت بھیا۔

مریضوں کی خیریت دریافت کرتا ہوا امت ٹھہر گیا۔ اُس کے دوست بھی چونک گئے۔ نمیتا بھاگتی ہوئی ان کی طرف آ رہی تھی۔

''کیا ہوا نمیتا؟......

نمیتا نے قریب آ کر لمبی چلتی ہوئی سانسوں پر قابو پایا۔ پھر گھبراہٹ اور پریشانی کے ملے جلے لہجے میں بتایا......''وہ لڑکی مر گئی''......

امت کے چہرے پر خون سمٹ آیا تھا۔

''اب ہم اُس ڈاکٹر کے بچے کو زندہ نہیں چھوڑیں گے...... اصغر غصے میں بولا۔

''نہیں — '' امت نے کچھ سوچتے ہوئے کہا...... ڈاکٹر سے ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے یہ بتاؤ اُس کے ماں باپ کہاں ہیں۔

''وہیں بیٹھے رو رہے ہیں......''

''تم وہیں جاؤ۔اور دلاسہ دینے کی کوشش کرو۔ہم ابھی آتے ہیں۔''

''نمیتا لوٹ گئی۔''

پرتپال نے دریافت کیا۔کون تھی وہ لڑکی؟'' وہ ابھی ابھی اسپتالوں کے چکر لگا کر لوٹا تھا۔اس لئے اس بارے میں اُس کو کچھ علم نہ تھا۔

''ایک بدنصیب لڑکی— ''امت نے آہستہ سے کہا......ڈاکٹر نے خراب آنکھ کے آپریشن کے سلسلے میں اس کی اچھی آنکھ چھین لی۔اور وہ محبت کی دنیا سے بہت دور نکل گئی۔''

پھر اس نے اصغر کی طرف دیکھا ''ہم نے جب محبت کو اپنا اصول بنایا ہے تو اس اصول پر قائم رہیں گے ...... ہم کوئی انتقام نہیں لیں گے— کوئی جلوس نہیں نکالیں گے۔اب ہمیں اُس لڑکی کی آخری رسومات کی فکر کرنی چاہیئے۔

امت بوجھل قدموں سے خیمے کی طرف بڑھا۔مغموم گیت خیمے میں گونج رہا تھا—امت کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ...... وہ کمزور آواز میں لڑکی کے بدقسمت ماں باپ سے مخاطب ہوا۔

''میں نے اس لڑکی کو اپنی بہن کہا تھا۔اور بہن کو یقین دلایا تھا کہ دنیا بڑی خوبصورت ہے......زندگی بڑی پیاری شئے ہے مگر......''

امت رو رہا تھا......وہ یہاں اپنے آنسو روکنے میں ناکام رہا تھا—

باب ھفتم

سفر

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں
اقبال

(۱)

جب زندگی کی ساری امنگیں گم ہو جائیں، خواب مرجھا جائیں، بھروسہ اٹھ جائے تو انسان کے پاس ایک ہی راستہ بچتا ہے۔ اور وہ راستہ مذہب کا راستہ ہے۔ کریم بیگ نے بھی ایسا ہی کیا اور مطمئن ہوئے کہ مذہب ساری پریشانیوں سے چھٹکارا دلانے میں ان کی مدد کرے گا ......مگر جو صدمہ محلے والوں نے دیا تھا۔ وہ صدمہ اس قدر عظیم تھا کہ باوجود ضبط کرنے کے آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھیں۔ مذہب کی شرن لے کر انہوں نے خود کو اللہ کے حوالے کر لیا تھا۔ اور نوکری سے نکالے جانے کا بھی کوئی غم نہ تھا...... پھر اپنے ہی محلے کی مسجد میں امامت کرنا زندگی کا اہم ترین اعلان تھا......اور اس اعلان پر وہ ابھی جی بھر کر مسکرائے بھی نہ تھے کہ اچانک خبر ملی کہ ان کی بیماری نے انہیں امامت کے منصب سے بے دخل کر دیا۔ اچانک گہرے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ انجم جیل میں تھا اور وہ زندگی کی نئی جنگ لڑ رہے تھے۔

دوسرے غموں کی طرح اس بار وہ سمجھوتا نہ کر سکے۔ ٹوٹ کر رہ گئے۔ بس لے دے کر ایک امت ہی سہارا بنا ہوا تھا۔ وقت بے وقت آ جاتا۔ تسلیاں دیتا۔ رضیہ کو سمجھاتا۔ محلے کی دکان سے سودا سلف لے آتا......کبھی اپنے گھر سے ہی پکا ہوا کھانا لے آتا...... کریم بیگ امت کے احسانوں کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔ کچھ سمجھاتے یا کہنا چاہتے تو امت محبت کے ایسے ایسے فلسفے سامنے رکھ دیتا کہ بے اختیار

ان کے آنسو نکل پڑتے پھر بھی جی کڑا کر کے کہتے ......جیسے انجم میرا بیٹا ہے ویسے تم بھی ہو......مگر بیٹا! یہ پڑے پڑے ٹھوسنا اچھا نہیں لگتا ہے......اللہ پاک موت دے دے وہ بہتر مگر کسی کو جسمانی طور پر اتنا کمزور نہ بنائے کہ دوسرے کے سہارے زندگی کی گاڑی آگے بڑھے ...... وقت کیسے کیسے انوکھے کھیل دکھاتا ہے، سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی اس قدر کمزور بھی ہونا پڑے گا......

آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگتے......اور امت ناگواری کے لہجے میں کہتا...... چاچا۔ اتنا غیر سمجھ رکھا ہے ہمیں—— ہم نے تو کبھی آپ کو غیر نہیں سمجھا۔ اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر یہ دوسرا کہاں سے آ گیا۔ ہم غیر کیسے ہو گئے۔ کل انجم جیل سے چھوٹ جائے گا۔ تب تک تو ہمیں خدمت کا موقع دیجئے '۔

امت کی اس بات پر انہیں چپ ہو جانا پڑتا۔

وہ برابر بڑھاپے سے لڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عبادت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ جب بھی خود کو کسی لائق پاتے۔ محلے کی مسجد کی طرف نکل جاتے۔ اب وہاں ایک دوسرے مولانا آ گئے تھے۔ وہاں شیخ صاحب اور سید صاحب بھی ہوتے۔ نماز کے خاتمے کے بعد یہ لوگ ہمیشہ کی طرف وہاں ٹھہرتے اور پھر بحث چھڑ جاتی۔ مگر اب کریم بیگ وہاں ایک پل نہیں ٹھہرتے۔ نماز پڑھتے اور سر جھکائے گھر روانہ ہو جاتے—— سید صاحب اور شیخ صاحب بس یہی سمجھتے کہ بیماری نے کریم بیگ کو بہت کمزور کر دیا ہے۔

اس دن عصر کی نماز سے فارغ ہو کر کریم بیگ گھر لوٹ رہے تھے—— طبیعت اس قدر خراب لگ رہی تھی کہ چکر پہ چکر آ رہے تھے۔ دو ہی رکعت کے بعد ایسا احساس ہونے لگا، جیسے اب گر جائیں گے—— کچھ دیر تک مسجد کے صحن میں بیٹھ کے ہانپتے رہے۔ کسی طرح جی کڑا کر کے پوری نماز پڑھی۔ سانس درست کیا۔ پھر اٹھے۔

آنکھوں کے آگے کتنے ہی دھندلے خاگے منڈلا رہے تھے۔ ذہن تاریک ہوا جا رہا تھا۔ بڑھاپا شاید میری بینائی چھیننا چاہتا ہے۔ کچھ ایسے ہی احساس اندر اُٹھ رہے تھے۔ شاید امتحان کا وقت آ چلا ہے۔ وہ دکھا دیں گے۔ کچھ ایسا یقین ہے کہ وہ اُس کے کسی بھی امتحان میں پیچھے نہیں رہیں گے۔ وہ جو چاہے کرے —— وہ تو صبر ایوبی کے قائل ہیں۔ اور رہیں گے۔ اور ان کی عبادت میں کوئی فرق نہیں آنے پائے گا۔

مسجد سے اُترے اور گھر کی طرف چل دیئے۔ سر بری طرح سے گھوم رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے کا اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

آگے موڑ پر کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ معصوم بچے۔ آپس میں گھیرا بنائے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے گولائی میں گھوم رہے تھے۔ وہ بس اسی قدر دیکھ سکے۔ بچے گھیرا بنائے گھوم رہے تھے۔

''اگڑم بگڑم دہی چٹا کن

بڑ پھولے بڑیلا پھولے۔ پھولوں کی پھلواری ہے۔

بابا جی کی باری ہے۔

پکے پکے آم کھاؤں۔

کچے کچے نیول کو دوں۔

نیول گئی چوری

اٹھا ٹپک کچوڑی......ڑی......

اچانک سب بچے ٹھہر گئے

کریم بیگ کی آنکھوں تلے ایک دم سے اندھیرا چھا گیا۔ جسم جیسے ہوا میں اڑتا جا رہا تھا۔ اچانک حلق سے گھڑ گھڑ کی تیز آواز نکلی اور دوسرے ہی لمحے وہ چکرا کر سڑک پر گر گئے۔

بچے زور سے چیخے —— کریم چاچا

پھر سب اپنا کھیل بھول گئے۔ سڑک سے گزرتے لوگ ہمیشہ کی طرح ہونے والا ایک حادثہ سمجھ کر آگے بڑھ گئے۔ مگر بچوں کی یہ چھوٹی سی جماعت کریم چاچا کو گھیرے میں لئے کھڑی تھی۔

ایک بچے نے دوسرے سے پوچھا۔ اب کیا کیا جائے۔؟''

دوسرے نے معصوم انداز میں کہا۔ انجم بھیا! تو جیل میں ہیں۔''

تیسرا بولا۔ امت بھیا کو خبر کرنی چاہئے۔ امت بھیا اس وقت کیمپ میں ہوں گے۔

یہ تیسرا ان سب میں سب سے عقلمند لگ رہا تھا۔

اس نے پھر کہا......تم لوگ رکشہ کر کے کریم چاچا کو ان کے گھر پہنچا دو۔ میں امت بھیا کو خبر کر کے آتا ہوں۔''

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ پاس میں گھر تھا۔ سائیکل اٹھائی۔ اور کیمپ کی جانب نکل گیا۔ اُس کے دوست لڑکوں نے پاس سے گزرتا ہوا۔ خالی رکشہ روکا اور کریم چاچا کے بے ہوش جسم کو سنبھالتے ہوئے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔

(۲)

راحت کیمپ میں اب چہل پہل کافی بڑھ گئی تھی۔شہر کے لوگوں کو اپنی نوعیت کے اس واحد حفاظتی کیمپ کی خبر مل چکی تھی۔ جب انہوں نے محبت کے اس عظیم الشان مشن کے بارے میں سنا تو جیسے وہ وادیٔ بدبو سے نکل کر اچانک محبت کی خوبصورت دنیا میں آ گئے۔ ہر کوئی امت اور اس کے دوستوں کی دل کھول کر تعریف کرر ہا تھا۔آس پاس کے غریب طبقے کے بہت سارے لوگ بھی امت اور اس کے دوستوں سے ملنے پہنچ گئے۔کئی کئی لوگوں کا وفد ان سے ملنے آتا۔اور محبت کے ماحول میں سانس لینے کا عہد کرتا— علاوہ ازیں بدبو کے بیمار مریضوں کی تیمارداری میں جٹ جاتا۔یہی وجہ تھی کہ اب وہاں چہل پہل کافی بڑھ گئی تھی۔امت کے دوستوں کے علاوہ سینکڑوں لوگ جو انسانی جذبات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے وہاں پہنچ گئے تھے اور جی جان سے مسکراتے ہوئے مریضوں کی دیکھ بھال میں لگ گئے تھے— کوئی رکشے پر مریض لاتا۔کوئی بدحال مریضوں کو پھل کھلا رہا ہوتا۔کوئی گھڑے میں پانی لے کر دوڑ دوڑ کر پانی پلا رہا ہوتا— کوئی چوکیاں اور چارپائیاں اپنے گھر سے لاکر میدان میں بچھاتا ہوا دکھائی دیتا۔کوئی جلدی جلدی خیمے نصب کرتا۔ پلنگ درست کرتا۔ چادریں بچھاتا۔مریض کو سہارا دیتا ہوا لٹاتا۔ قصے کہانیاں سناتا۔ ہنسانے کی کوشش کرتا۔کئی دوسرے طریقوں سے بھی مریضوں کو خوش رکھنے اور ہنسانے کی کوشش کی جاتی۔ان کا دل بہلایا جاتا۔کچھ دوست احباب اپنے اپنے گھروں سے ریڈیو۔ٹیپ رکارڈر وغیرہ لے آئے تھے۔کوشش کی جا رہی تھی کہ مریض لفظ بیماری سے الگ ہو جائیں۔اپنا مرض بھول جائیں۔ان کی مردہ دلی ختم ہو جائے۔اور ان کے اندر جینے کا تجسس پھر

سے جاگ اٹھے۔امنگیں جاگ جائیں......حوصلہ پیدا ہو اور وہ نئے سرے سے زندگی کی امنگوں میں ڈوب سکیں۔

ایسے موقع پر امت کے لئے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنا مشکل ہو جاتا—

کون کہتا ہے اچھائی مٹ گئی۔

کون کہتا ہے کہ اس ملک سے محبت مٹ گئی۔حیرت تو یہ ہے کہ کبھی ان کے دلوں کی تلاشی نہ لی گئی۔ان کے اندر دبے محبت کے جذبے کو محسوس ہی نہ کیا گیا۔اور جذبہ اندر ہی اندر مرجھاتا رہا— ان لوگوں کا جوش خروش۔غیروں کے لئے ایسی محبت دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں فرق کی دیواریں اب بھی بلند ہیں۔مگر اس طرح کہ سب ایک دوسرے میں گھلے ملے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ایک غریب بیمار ہے اور ایک امیر بڑے پیار سے مسکراتا ہوا باتیں کرتا ہوا— اُس کے سر پر بھیگی ہوئی پٹی رکھ رہا ہے اور معمولی کپڑوں میں ملبوس ایک جھری نما ہاتھ اُس پر جھکا ہوا ہے......غرض کتنے ہی ایسے منظر ہیں......خوبصورت......دل فریب......کون کہہ سکتا ہے کہ اس ملک سے اچھائی مٹ گئی— پہچاننے والی آنکھیں ہونی چاہیں۔ بھاشن نہیں عمل چاہئے۔

امت کی آنکھیں نم تھیں......میرے دوست انجم! کاش آج تم جیل کی چہار دیواری میں قید نہ ہوتے......دیکھتے کہ آج تمہارا اور ہم سب کا مشن کس قدر کامیاب رہا ہے۔تم نے ٹالسٹائی اور گاندھی کے جن خیالوں کی پیروی کی تھی......آکر دیکھتے کہ پھیلی ہوئی تیز بدبو ان کے درمیان اب کہاں ہے؟ دراصل ہمارا سست کاہل سماج ہی اس بدبو کی پیداوار ہے......محبت کے اس خوبصورت ماحول میں جہاں ہر شخص زیادہ سے زیادہ ثواب بٹورنے کا خواہشمند نظر آتا ہے، مجھے اس طرح کی کوئی بدبو محسوس نہیں ہو رہی......''

لڑکے لڑکیوں کے جسم میں جیسے مشین فٹ تھی۔تھکن کا نام ونشان تک نہ تھا۔

خیمے سے باہر نکلی ہوئی چارپائی پر اپنے فلاسفر دوست کو لیٹے ہوئے دیکھ کر امت رُک گیا ......اس شخص کی آنکھیں اب بھی بند تھیں اور وہ ویسی ہی بند آنکھوں سے امت کے قدموں کی آہٹ پا کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''گڈ ایوننگ مائی فرینڈ......''

''گڈ ایوننگ'' امت کو حیرت ہوئی......کم بخت سلام کرنے میں ہر دم بازی لے جاتا ہے۔ جواب نہیں ہے اس کے مشاہدے کا— آہستہ سے پوچھا......'' کیسے ہیں آپ؟''

بڑے ڈرامائی انداز میں اس شخص نے اپنی ایک آنکھ کھولی اور مسکرا دیا۔

''اچھا ہوں۔ بہت اچھا ہوں۔ اب سچ مچ ایسا لگنے لگا ہے جیسے میری کھوئی ہوئی طاقت پھر سے لوٹ آئی ہو۔ اب تو سب کچھ بڑا ہی خوشنما لگنے لگا ہے......تم اچھے لگ رہے ہو...... یہ آسمان اچھا لگ رہا ہے......اور سب کچھ اچھا لگ رہا ہے۔

وہ ذرا ٹھہرا......پھر بولا......'' مجھے افسوس ہے میرے دوست! کہ میرے جیسا آدمی، جو کبھی شکست پر یقین ہی نہیں رکھتا تھا کتنا بزدل بن گیا تھا۔ زندگی واقعی اس قدر خوبصورت ہے کہ جیا جائے۔ مگر ہوتا یوں ہے کہ کسی بھی حادثے سے گھبرا کر ہم بہت جلدی ٹوٹ جاتے ہیں اور ناامیدی کے فیصلے پر خود پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر ایک آدمی بھی ہم میں سے مضبوط ہو جائے تو آج ایسی صورت حال پیدا نہ ہو۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں میرے دوست کہ یہ زندگی اور جینے کی اُمنگ اب تمہارے ہی احسان کی بدولت ہے۔

اچانک ایک تیز آواز کے کانوں میں آئی۔

''امت بھیا۔''

یہ وِمل چٹر جی تھا جو سائیکل سے اُتر کر تیزی سے اس کی جانب سے بڑھ رہا تھا۔

''کیا بات ہے'' امت چونکا۔

''کریم چاچا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ سڑک پر گر گئے تھے— بچوں نے انھیں گھر پہنچا دیا ہے......بس آپ کو خبر کرنے چلا آیا۔

وِمل چٹر جی نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔ امت سن سے رہ گیا۔

پھر ڈوبتی ہوئی آواز میں بولا۔'' تم نے اچھا کیا کہ سائیکل ساتھ لے آئے— چلو پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ میں چلاتا ہوں۔

جس وقت وہ وِمل چٹر جی کے ساتھ وہاں پہنچا اُس وقت بہت سے بچے کریم چاچا کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔ کریم چاچا کو اب تک ہوش آ چکا تھا۔ رضیہ چاچی مردہ سی ایک طرف سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ کوئی بچہ پنکھا جھل رہا تھا۔ کوئی گلاس سے پانی پلا رہا تھا۔

ہوش میں آ گئے چاچا'' امت نے ڈبڈبائی آنکھوں سے پوچھا اور پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ سرد پیشانی تھی۔ پسینے کے قطرے چھلچھلاتے ہوئے تھے......

''ہاں اب طبیعت ٹھیک ہے— ذرا چکر آ گیا تھا۔'' کریم بیگ انتہائی کمزور آواز میں بولے۔

''جب طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہے تو آپ مسجد کیوں جاتے ہیں— گھر میں ہی نماز کیوں نہیں پڑھتے؟''

''مسجد میں بہت سارے لوگوں کے ساتھ ایک ہی صف میں نماز پڑھتے ہوئے اچھا لگتا ہے......بس اسی لئے چلا جاتا ہوں۔ کیا معلوم تھا......''

کریم چاچا کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ بولتے بولتے اچانک کھانسی اُٹھ

گئی۔ پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانستے ہوئے بولے ......'' اب ٹھیک ہوں بیٹا......اب ٹھیک ہوں......''

امت کا لہجہ اچانک بھرا گیا۔ کریم چاچا کی حالت ایسی کبھی نہ تھی۔ زمانے کی تیز بدبو پی کر انہوں نے یہ حالت کر لی تھی۔ آہستہ سے زیر لب بڑبڑایا......آپ ٹھیک نہیں ہیں کریم چاچا۔ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ آج ان لوگوں سے حساب طلب کروں گا جو عذاب عذاب چلاتے ہیں مگر عذاب کی وجوہات پر غور نہیں کرتے......''

اور اس سے پہلے کہ کریم بیگ اس کے چہرے پر آئے عجیب وغریب رنگ کو پڑھ پاتے، وہ تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔

امت جانتا تھا۔ اس وقت مغرب کی نماز کے لئے لوگوں کا پہنچنا شروع ہو جاتا ہے......وہ تیز تیز چلتا ہوا مسجد کے گیٹ کے پاس آکر ٹھہر گیا۔ چھوٹی سی مسجد تھی۔ صحن میں ہی نماز ہوتی تھی— اب بھی وہاں چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے بہت سے لوگوں کے ہمراہ شیخ صاحب اور سید صاحب بھی تھے۔

''میں آسکتا ہوں۔''

امت نے گمبھیر آواز میں کہا۔'' میں آپ کے مذہب کا نہیں۔ لیکن کیا آپ کا مذہب اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ایک غیر مذہبی لڑکا اس طرح آپ کی عبادت گاہ میں داخل ہو جائے۔''

''بات کیا ہے۔؟'' سید صاحب اور شیخ صاحب دونوں نے امت کو دیکھ کر پوچھا۔ ایک ہی محلے میں رہنے کے باعث سب ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔

''پہلے اندر آنے کی اجازت دیجئے— تب کہوں گا۔''

شیخ صاحب اور سید صاحب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر کہا۔'' یہ تو

خدا کا گھر ہے۔ سب کے لئے کھلا ہے۔ تم بھی آجاؤ۔''

امت نے چپل اُتاری اور تعظیم کے ساتھ اندر داخل ہو گیا— ٹکڑے ٹکڑے سانس بٹوری۔ پھر ان لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

کہتے ہیں عبادت اس لئے کی جاتی ہے کہ سب کو وہاں نیکیوں کا حساب دینا پڑتا ہے— مگر یہ کیسی تعلیم ہے کہ ایک شخص ہمارے درمیان مر رہا ہے اور ہم اُس کو بھول کر اپنی عبادت میں مشغول ہیں......میرے خیال میں ایسی عبادت نہیں چاہئے۔ یہی پیغمبرؐ صاحب تھے جنہوں نے فرمایا تھا۔ کھانے سے قبل اپنے آس پاس کے چالیس گھر کھوج لو......تب کھاؤ......اگر کوئی بھی بھوکا رہ گیا۔ تو تمہارا کھانا حلال قرار نہیں دیا جائے گا......مگر کیا آج اس تعلیم کا اثر ہے......؟......میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے جب بدبو کے اس بھیانک سیلاب کو ہم اور آپ سب نے مل کر عذاب اور پر لئے تصور کر ہی لیا ہے۔ تو اس کی وجہ پر غور کرنے کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی جاتی۔''

''مطلب؟'' شیخ صاحب سب چونکتے ہوئے بولے۔

''مطلب ہے......ہمیں تو یہ سوچنا ہے کہ ہماری عبادت قبول بھی ہو رہی ہے یا نہیں۔ کیا ایسے لوگوں کی عبادت قبول ہوگی......جو قوم اپنے پیش امام کی قدر بھی نہ کر سکے۔ آپ نے کریم چاچا کو عزت دی......امامت کا عہدہ دیا۔ ان کے پیچھے کی صفوں میں نماز پڑھی۔ ان کے ساتھ ساتھ مل کر اپنے گناہوں سے توبہ کی......اور جب وہ بیمار رہنے لگے تو ان کو عہدے سے ہی الگ نہیں کیا بلکہ انہیں بلکل بھلا ہی بیٹھے......آپ نے انہیں مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ جو قوم اپنے پیش امام کی قدر نہ کر سکے وہ قوم کہاں جائے گی، یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کا پیش امام عصر کی نماز سے لوٹتے ہوئے راستے میں گر پڑا۔ اور اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہے......

ماحول میں خاموشی چھا گئی——

اچانک ان میں سے ایک آہستہ سے بڑبڑایا۔ ''مولوی کریم گر گئے''

شیخ صاحب اور سید صاحب کی نظریں بھی جھک گئی تھیں......

شیخ صاحب نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''ہم شرمندہ ہیں بیٹے۔ بہت بہت شرمندہ ہیں۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر ہم سب سیدھے مولوی کریم سے ملنے جائیں گے اور ان کا معاوضہ باندھ دیں گے۔''

''ہم واقعی شرمسار ہیں۔''

امت نے سکون کی سانس لی——

اور آہستہ آہستہ مسجد کی سیڑھیوں سے اُتر گیا——

امت لوٹ کر جب دوبارہ وہاں پہنچا تو کریم بیگ کی طبیعت بہت خراب ہو چکی تھی۔ دل کا دورہ پڑا تھا۔ آنکھیں باہر اُبل آئی تھیں۔ پیٹ دابے وہ دیر تک کراہتے رہے۔ پھر بیہوش ہو گئے۔

''انہیں کیمپ میں اسی وقت داخل کرنا ہوگا۔ زیادہ دیر کرنا ٹھیک نہیں۔ حالت بگڑتی جا رہی ہے۔''

امت اتنا کہہ کر رکشہ لانے نکل گیا۔ رضیہ آس پاس کی عورتوں کے درمیان بالکل بے جان اور گم سم بیٹھی تھی۔

ایک بوڑھا آہستہ سے بولا۔ کتنا خراب زمانہ ہے۔ اپنوں کا دکھ بابو کریم کب تک اٹھاتے، برداشت نہیں کر پائے۔''

شام کے سائے آسمان پر گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ کیمپ میں بوڑھے

کریم کی شاید آج آخری رات ہے۔ ڈاکٹر نا امیدی کے عالم میں جھکا ہوا ہے—— کیمپ روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ جیسے پورا ہندستان سمٹ آیا ہو...... اور وہاں کتنی ہی آنکھیں ہیں جو خاموش ہیں...... جو آنسو بہا رہی ہیں۔ امت بھی چپ ہے...... ہیڈ ماسٹر رگھو پتی سہائے جی بھی خاموش ہیں۔

اور نمیتا بھی...... آنکھیں آنسوؤں سے تر...... دل میں خوف کی بارش—— انجم تم بہت دیر کر رہے ہو...... آتے کیوں نہیں......؟

مگر......

کوئی آ رہا ہے...... یہ دھندلا دھندلا سا دبلا پتلا سا شخص کون ہے...... بالکل مرجھایا سا...... بہت کمزور ہو گیا ہے...... شاید انجم ہے......

کیسا عجیب و غریب سفر ہے۔ روح انسانی بدن سے رشتہ توڑ کر آسمان میں پرواز کر جاتی ہے۔ اور ایک سرد جسم کو چار کندھوں کی سواری پر اُس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

محلے والوں کے زور دینے پر آج انجم کو ضمانت مل گئی ہے۔

کریم بیگ کے اس آخری سفر میں ہزاروں لوگ شریک ہیں—— سارا شہر سمٹ آیا ہے......

انجم پتھر کی مورت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ساری دنیا گھومتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ وہاں موجود ہر شخص رو رہا ہے......

سفر کی شروعات ہو گئی ہے...... آخری سفر کی شروعات......

مولانا کریم جا رہے ہیں...... وہ شخص جو دوسروں کے لئے لڑتا رہا...... وہ شخص جو محبت ہر دل میں تقسیم کرتا رہا...... مگر اسے کیا ملا...... اتنے سارے لوگوں کی محبت کم تو نہیں ہے......

سب کی آنکھیں نم ہیں......ان میں شیخ صاحب بھی ہیں— سید صاحب بھی......

کیمپ میں اس فلاسفر شخص کی اچانک دونوں آنکھیں کھل جاتی ہیں......آنسو کے موٹے موٹے قطرے تکیئے پر ڈھلک جاتے ہیں۔

مولانا کریم جارہے ہیں......اناللہ وانا الیہ راجعون۔

کمرے میں لوبان جل رہا ہے...... گہرا سناٹا ہے۔

مولانا کریم بیگ کی آخری رسومات سے فارغ ہو کر لوگ لوٹ آئے ہیں۔ افسردہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا انجم، امی حضور کے پاس آکر ٹھہر گیا ہے......وہاں کچھ بھی تو نہیں ہے......نہ کوئی احساس ......نہ کوئی جذبہ......صرف پیچھے سے آنے کا دلاسہ دیتی ہوئی ساکت آنکھیں ہیں۔نمیتا کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے انجم کو سہارا دیا ہے...... دو بھیگی بھیگی آنکھیں بہت سارے لوگوں کی موجودگی کے باوجود سوالیہ نشان بن کر انجم کی آنکھوں میں اتر گئی ہیں......''اتنے ٹوٹ جاؤ گے۔تو پھر مجھے سہارا کون دے گا...... بولو......؟'لفظ گونج رہے ہیں......

انجم نے پلٹ کر نمیتا کی طرف دیکھا—

نمیتا نے پلکیں جھکا لیں...... جیسے کہہ رہی ہو...... میں ہوں نا......گھبراتے کیوں ہو......زندگی کا یہ سفر یوں ہی جاری رہتا ہے......

فضا میں لوبان اور اگربتی کی مہک پھیلی ہوئی ہے— دلاسہ اور تسلی دے کر لوگ واپس اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں— اور یہاں—

محبت نے خاموشی سے اپنا دروازہ کھول لیا ہے......

میں ہوں نا......

نمیتا نے انجم کے ہاتھوں کو تھام لیا ہے......

آسمان پر ستارے روشن ہیں......

انجم نے پلٹ کر نمیتا کی طرف دیکھا ہے......

آسمان پر بادلوں کے آوارہ ٹکروں کے درمیان ستاروں کا رقص جاری ہے۔

محبت گم کہاں ہوتی ہے/

محبت ہمیشہ موجود رہتی ہے

نفرت اور ماحول میں پھیلی ہوئی

تیز بدبو کے باوجود/

——۱۹۸۲

ختم شد